# مجلس مشاورت

## صدر

**پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب**

ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (کینٹب)

نائب معین امیر جامعۂ عثمانیہ

## مشیر حصّۂ اردو

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر اردو جامعۂ عثمانیہ

## مشیر حصّۂ انگریزی

مسٹر ایم۔ ایس درے سوامی بی۔ اے (آکسن) ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی (مدراس) ریڈر انگریزی جامعۂ عثمانیہ

## معتمد اعزازی

مولوی سید محمد یونس صاحب وفا قافی بی۔ اے (عثمانیہ) ایم۔ ایس۔ سی (ڈھاکہ) اے۔ ایم آئی۔ آر۔ ای (لندن)

## خازن اعزازی

پروفیسر محمد سعید الدین صاحب بی۔ ایس سی، ایم۔ اے، (اڈنبرا) ایف۔ آر۔ ایم۔ ایس۔ ایف۔ ایل۔ سی

# اطلاع

( ۱ ) تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلّہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔
( ۲ ) خریداری اور دیگر امور کے لئے مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ سے مراسلت کی جائے۔
( ۳ ) چندہ کی تمام رقمیں خازنِ اعزازی مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں۔

# چندہ

( ۱ ) موجودہ طلبہ جامعۂ عثمانیہ سے .................. ۱۲ ؍
( ۲ ) طلباء قدیم و اساتذہ جامعہ عثمانیہ سے .................. ۲ ؍
( ۳ ) عام خریداروں سے .................. ۳ ؍
( ۴ ) فی شمارہ .................. ۱۲ آنہ

سالانہ اخراجاتِ ڈاک حسب ذیل ہوں گے اور بصورت منی آرڈر اخراجاتِ ڈاک میں کمی ہوگی۔
۱۔ بذریعہ رجسٹری ایک روپیہ آٹھ آنے کلدار ۔ ۱۳/ سکہ عثمانیہ۔
۲۔ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کے وی پی کے اخراجات ۱۴/ کلدار ۶/ سکہ عثمانیہ۔
۳۔ بذریعہ بک پوسٹ ۹/ آنے کلدار ۶/ سکۂ عثمانیہ۔

# فہرست مضامین

جلد (۱۶) شمارہ (۳)

| صفحہ | مضمون نگار | مضمون | نمبر شمار |
| --- | --- | --- | --- |

## عمرانیات



## فلسفہ



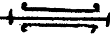
## افسانے



## نباتیات



## جادۂ فکر



# ارشادات ہمایونی

## حضرت بندگان عالی مدظلہ العالی

# مشورۂ نیک برائے طلبائے عثمانیہ یونیورسٹی

در خیال ما برائے اینها دوران حصولِ تعلیم حصه در امور سیاسی ملک گرفتن (یعنے در پالٹیکس) مفید نه باشد که هرچه نتائج آن در مسائل مقدمات خواه اندرون ملک باشند یا بیرون به وقوع آمده اند و آن هم از چشمِ ایشان پوشیده نیست بلکه عالم آشکار انظر بر آن این ها را لازم که قبلِ اختیار کردن امرے بر مالهٔ و ماعلیه آن نظرِ غایر به دارند تا که پشیمانی غلط اقدام دامنگیر ایشان نه شود ! !
آرے این ممکن است که بعد حصولِ تعلیم اگر این ها خود را قابل ثابت کرده در امور هستند که حصه شرکت به کنند و آن هم با حزم و احتیاط و هم با فراست و دانشمندی که شیوهٔ همه عقلا و مدبرینِ جهان است (یعنے ہلتھی پالٹیکس) مضائقه نباشد بشرطیکه هر شئے اندرون حدودِ متعینه باشد و هم اختیار کرده بعد غور و خوض بسیار که واقعی ره نوردی در این کوچه پرخار آسان نیست بلکه خیلے دشوار و هم ایشان باید دانست که بغیر آمدِ بهار صبا در چمن جلوهٔ خرامی نه نماید و هم بر طرفِ دیگر گلهائے نوع به نوع تبدیل لباس نه کنند تا وقتیکه لوازمهٔ بساطِ گلزار به احسن الوجوه مهیا نه باشد ورنه کسے خواهشمندِ نظارهٔ منظرِ خوش نخواهد شد و این همه اسباب از "فیضان قدرت" پیدا می شوند تا که آبیاری و شادابی چمن مفقود نه شود بلکه بر جائے خود بر پایهٔ استوار باقی ماند۔

طبع شده

در اخبار صبح دکن ششم ماه ذیقعده سنه ۱۳۶۰ هجری

# کلّیهٔ مسلّمهٔ دُنیا

آنان که در دماغ خود مادهٔ تکبّر و نخوت می دارند یا جلب منفعت پیش نظر ایشان باشد یا خود را عادیٔ زندگیٔ عیش و عشرت ساخته اند یا قلوب ایشان از خدمتِ بنی نوع انسان خالیست یا از جوهر همدردی و اعانت محروم - هرگز در مقاصد خود کامیاب نمی شوند یا خود را برائے خدمتِ خلق الله اهل ثابت نمی کنند و اصل سبب ناکامیٔ این امور فقدان استقامت مذهب و هم عقاید باشد و هم قصور همت و جرأت در تکمیل امور دنیوی که حق و صداقت چه چیز هست ازان یک لخت هنها ناآشنا که نتیجه اش بجز این چیزے دیگر نیست که در راهِ ظلمت منزلِ مقصود را تلاش کنان سرگردان می باشند ازین سبب گفته اند که "آبِ حیوان" را بدست آوردن آسان نیست بجز رهنمائی خضرؑ یا این آن دُرِ شهوار است که در قعرِ دریا به بطن صدف نشسته است و تا وقتیکه غواص جوهر شناوری نه نماید آن در کفش نمی آید که بغیر زحمت نواله هم در دهان نمی رسد.

خلاصه اینکه انسان را باید که حتی الامکان از صفاتِ برگزیده در خود پیدا کرده دعویٔ نشستن در صفِ صاحبانِ ضمیر و کردار بکند ورنه بغیر این شرط دعوی او بلا دلیل هیچ وقعت نزدِ منصف مزاجان یا عقلائے جهان نمی دارد.

به به چه کلّیهٔ زرّین است !!

طبع شده در اخبار نظام گزٹ یازدهم ذیقعده سنه ۱۳۶۰ هجری

# مسئلہ علم و فضل

لاریب کہ این شیئے گران بہاست و صرف در حصۂ آن ہا رہ حصہ رسیدی، می آید کہ فطرتاً برائے این "عطیۂ قدرت" مخلوق گشتہ اند و بہ طرف دیگر تکمیلِ ہمہ امورِ دینی باشند یا دُنیوی بر آن منحصر ازین سبب گفتہ اند کہ انسان بغیر علم و فضل و ادراک ما فیہا از صفتِ انسانی متصف نمی شود در صحیح مفہوم او ہم خدا و رسول را نمی شناسد و آنچہ فرایض کہ بر دوشِ او عاید اند یا بجائی ایشان از و ناممکن تا وقتیکہ شعورِ نزاکتِ آن ہا بہ ذاتِ خود نمی دارد۔

خلاصہ اینکہ این آن شیئے کمیاب ہست کہ در حصول آن تگ و دو بسیار کردنیست تا آنکہ او در دامنِ مراد بہ افتد۔ دیگر از علم و فضل منصب یا منزلتِ انسان شناخت کردہ شود کہ او چہ پایۂ در میان ابنائے جنس یا بنی نوعِ انسان می دارد الحاصل ضرورتِ علم و فضل در این دُنیا از حد ضروریست خصوصاً ما می بینیم کہ حالاتِ عالم را چہ تغیر دامن گیر شدہ است و ہم بہ چہ رنگ واقعاتِ گیتی قلابازیان می خورند کہ در این سیلاب صرف اقدام آن گروہ بر جادۂ استقامت می مانند کہ دل و دماغ ایشان از ضیائے علم و فضل منور ہست و ہم آن ہا مادۂ غور و فکر یا بالغ نظری در فن رائے زنی بر امورِ متنوعہ می دارند ور نہ ممکن نیست کہ از گردابِ انتشار ایشان رہائی یابند کہ طوفانِ باد و باران بہ شدّت نمودار شدہ است کہ کشتی بانی بہ پیشِ این موانعات خیلے دشواری نماید لہذا ضرورت است کہ بہ عقل و تدبیر کار کردہ زورق را بہ ساحلِ سلامتی بہ رسانند و این خدمتِ مدبّرین یا عقلائے جہان است۔

طبع شدہ در اخبار صبح دکن چہار دہم ذی قعدہ سنہ ۱۳۶۰ھ ہجری

# اداریہ

## مضامین

مجلۂ عثمانیہ جلد (۱۶) کا تیسرا شمارہ پیش کیا جا رہا ہے ــــــ حصۂ نثر میں آپ سب سے پہلے عالیجناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا وہ خطبۂ صدارت ملاحظہ فرمائیں گے جو انھوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو کے اجلاس میں پڑھا تھا۔ ڈاکٹر زور صاحب زبان و ادب کے سچے محسن اور رہنما ہیں۔ انھیں ہماری زبان سے والہانہ محبت ہے انھوں نے دکن کی نئی نسل میں اردو کی خدمت کا بے پناہ ولولہ غیر معمولی جوش اور عظیم تڑپ پیدا کردی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے اس خطبے میں مخالفین اردو کے ذہنی رجحانات اور اس کے نادان دوستوں کے تخریبی اسالیب کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہماری زبان کی تقویت و استحکام کے لئے تعلیم بالغان کی ترویج اور جابجا دارالمطالعے کے قیام پر زور دیا ہے اور اردو کی مختلف انجمنوں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ہے اس خطبے میں بہی خواہان اردو کی رہبری کے لئے تعمیری تجاویز کا بہت کچھ سرمایہ ہے۔

"پودوں کے مخصوص رنگ" پروفیسر محمد سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات کا معلومات افزا مضمون ہے ــــــ کتنی حسین ہوتی ہے پودوں کی دنیا! شاعر اور ادیب دونوں اس رنگین دنیا میں خود کو بھول جاتے ہیں۔ پھول، پتے اور پھل رنگ برنگ کے کیوں ہوتے ہیں؟ کہئے! کبھی آپ نے اس پر غور فرمایا ہے؟!! اس مضمون کو پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ نباتات کی جاذبیت

کا انحصار خوشبو اور رنگوں پر ہوتا ہے۔ پودوں کے گوناگوں رنگ گویا مقناطیس ہیں جو پرندوں اور کیڑوں کو کشش کرتے ہیں جن کے ذریعہ بیجوں کا انتشار اور باروری کا عمل ہوتا ہے۔

مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب کو خواتین دکن کی تحریک سے عمیق ترین دلچسپی ہے۔ انھیں اسی بناپر "حیدرآباد کے راشدالخیری" کے نام سے مخاطب کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ہاشمی صاحب سے ہم نے مجلہ کے جشن سیمیں نمبر کے سلسلے میں "دختران جامعہ کی اردو خدمات" کے موضوع پر مضمون لکھنے کی استدعا کی تھی۔ صاحب موصوف نے ہماری گزارش کو درخور اعتنا سمجھا جس کے لئے ہم مشکور ہیں۔ جامعہ کے جشن سیمیں کے التواء کے باعث مجلہ کی خصوصی اشاعت کا منصوبہ بھی پورا نہ ہوسکا حالانکہ ہم نے اس خصوصی شمارہ کا پورا خاکہ بھی مرتب کرلیا تھا۔

"غالب کی اردو شاعری" کے عنوان پر مولوی محمد اعظم صاحب ایم۔ اے لکچرار شعبۂ اردو نے قلم اٹھایا ہے۔ مضمون نگار نے غالب کی شاعری سے متعلق انتہا پسندانہ اختلافی اور تائیدی رجحانات کو پیش کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے ساتھ ہی کسی دیوان یا تصنیف کے مطالعے کے صحیح طریقے پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

پروفیسر جمیل الرحمن مرحوم پر خود مرحوم کے فاضل بھائی پروفیسر نعیم الرحمن صاحب نے ایک مضمون الہ آباد سے خاص طور پر روانہ کیا ہے جو شریک اشاعت ہے فاضل مضمون نگار نے سلجھے ہوئے انداز میں مرحوم کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

بزم فلسفہ کے لائق صدر قدرت اللہ صاحب نے عام فہم انداز میں ڈیکارٹ کے فلسفہ پر بحث کی ہے ضرورت ہے کہ قدرت صاحب فلسفہ کے دیگر خشک مباحث کو بھی دلچسپ بناکر پیش کریں۔

"عمرانیات کیا ہے" میں مصلح الدین صاحب صدیقی متعلم بی اے نے بڑی عمدگی سے عمرانیات کی ہمہ گیری کا تجزیہ کیا ہے۔ صدیقی صاحب جامعہ کے ایک نوخیز مضمون نگار ہیں جن میں مضمون نویسی کی بڑی اچھی صلاحیت ہے۔ انھوں نے کئی تحریری مقابلوں میں انعام اول بھی حاصل کیا ہے۔ مشق کے ساتھ مطالعہ بھی جاری رہے تو یہ مستقبل کے ایک کامیاب مضمون نگار ثابت ہوں گے۔

## منظومات

جناب سکندر علی صاحب وجد جامعۂ عثمانیہ کے قابل فخر شاعر ہیں —— ان کا تخیل رنگین، احساس لطیف اور مزاج حسن کارانہ ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں رنگینی اور گھلاوٹ کے ساتھ ایک خاص تڑپ پائی جاتی ہے —— "چلا گیا" میں وجد کے تخیل اور انداز بیان کی مخصوص لطافتیں نمایاں ہیں۔

"لمحات فکر" میں آپ شاعر کو ایک نکتہ سنج و نکتہ نواز فلسفی کی طرح حیات و کائنات، جنون وخرد، اور جبر و اختیار کے حجابات کو اٹھاتا ہوا ایک مقام بلند پر پائیں گے —— میکش جامعۂ عثمانیہ کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ یوں تو انھوں نے ہر صنف سخن میں فکر رسا کی جولانیاں دکھائی ہیں لیکن غنائیوں میں وہ آرٹ کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ ان کے غنائیے ہندوستان کی مختلف نشرگاہوں سے بار بار نشر کیئے گئے ہیں۔ میکش فی الحقیقت حیدرآباد کے سب سے بڑے غنائیہ نگار ہیں۔

"جامعۂ عثمانیہ" یوسف ناظم کی پرکیف نظم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شاعر نے جامعہ کی ایک شاہکار تصویر پیش کی ہے۔ لاحظہ کیجئے اور بار بار داد دیجئے۔

عظیم عثمانیہ بھی ہماری جامعہ کے بہت اچھے شاعر ہیں ان کی نظمیں ہندوستان کے معیاری رسائل میں چھپتی رہتی ہیں "میں کیوں خوش ہوں" میں انھوں نے جذبات مسرت کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔

"حقائق" مظفر الدین صاحب ظفر کی نظم ہے اس میں انھوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں پر شاعرانہ زبان میں تبصرہ کیا ہے۔ یہ نظم ظفر کے شگفتہ انداز بیان کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

## اردو کانفرنس

بزم اردو جامعۂ عثمانیہ کی سرپرستی میں روایتی جوش و اہتمام کے ساتھ اس سال دوسری سالانہ اردو کانفرنس کلیہ فنون میں منعقد کی گئی۔ پہلے اور دوسرے اجلاس کی صدارت علی الترتیب آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات اور ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے فرمائی۔ دونوں اجلاسوں میں اہم مباحث پر تقریریں ہوئیں مقررین میں مولانا سید سلیمان ندوی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کانفرنس کی غیر معمولی کامیابی ڈاکٹر زور صاحب کی رہبری اور معتمد بزم جناب مصلح الدین صاحب صدیقی کی پُرخلوص جد و جہد کی رہین منت ہے۔

اُردو کانفرنس کی ابتداء بین الکلیاتی اساس پر کی گئی تھی اب ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ یہ کانفرنس ہر سال بین الجامعاتی بنیاد پر منعقد کی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب جنہیں اُردو زبان سے بے پایاں دلچسپی ہے ہماری اس تجویز کو روبہ عمل لانے کے لیئے کارکنان بزم اُردو کو تمام سہولتیں بہم پہنچائیں گے۔

بزم اردو کا مالیاتی موقف مستحکم نہیں ہے اس لیئے ہماری رائے میں جامعہ کے ہر طالب علم کو خاص طور پر اس بزم کا رکن بن کر اُردو زبان سے اپنی محبت کا عملی ثبوت بہم پہنچانا چاہئے۔

## بزم معاشیات کا مستحسن اقدام

گزشتہ چند سالوں سے بزم معاشیات ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبۂ معاشیات کی عمیق توجہ و دلچسپی کے باعث کارہائے نمائش سے زیادہ ٹھوس تعمیری خدمات انجام دیرہی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ بزم مذکور نے اس سال ایک ایسے مفیدی علمی کام کا آغاز کیا ہے جو جامعہ کی دیگر بزموں کے لیے قابل تقلید ہے۔ اس سال حقیقت یہ ہے کہ اس بزم نے مختلف اہم معاشی موضوعات پر مقالات کا ایک سلسلہ شائع کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلباء کی ذہنی صلاحیت اور دماغی نشوونما دنیا کی کسی جامعہ کے طلباء سے کم نہیں ہے۔ بزم کے شایع کردہ مقالات کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

ہندوستان کے زرپر جنگ کے اثرات از محمد احمد خان صاحب محصول منافع زائد از سعید احمد صاحب مینائی حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات از محمد نظام الدین صاحب جنگ اور ہندوستان کا قومی قرضہ از محمد احمد خان صاحب حیدرآباد کی قیمتوں پر نگرانی از عبدالماجد صاحب امریکہ اور بین الاقوامی زر کے منصوبے از عطاالرحمن صاحب علوی انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے از محمد احمد خان صاحب کنیڈا اور بین الاقوامی زر کے منصوبے از خواجہ محمد شمس الدین صاحب ہندوستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے از سعید احمد صاحب مینائی جنگ اور غذا کا

مسئلہ از شفیق الرحمن صاحب ہندوستان کی معاشرتی ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل از سعید احمد صاحب ہمدانی

ہم تمام عہدہ داران بزم معاشیات خاص کر جناب سید عابد حسین صاحب رضوی بی اے صدر بزم اور مسٹر کے آر نرسا ریڈی معتمد بزم کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کے زمانے میں بزم نے اس مستحسن اقدام کے ذریعہ اردو زبان کی بہت بڑی کمی کی تلافی کی مہم شروع کی ——— ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی کی رہبری میں یقین ہے کہ یہ مہم ہر طرح کامیاب رہے گی۔

## سر کا خطاب

آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات کو ان کی ہمہ جہتی خدمات عالیہ کے اعتراف کے طور پر برطانیہ عظمی نے "سر" کا خطاب عطا کیا ہے۔ نواب صاحب نواب عماد الملک جیسے رفیع الشان محسن ملک و قوم کے خانوادۂ جلیلہ کے ایک رکن رکین ہیں۔ نواب صاحب کو علم نوازی اور علم پروری کی صفات اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں۔ ان کے قومی تعمیری کارنامے اور سیاسی و تعلیمی خدمات جدید حیدرآباد کی تاریخ کے ناقابل فراموش ابواب ہیں۔ انھوں نے وزیر مالیات و سیاسیات و صدر المہام تعلیمات کی حیثیت سے ملک کی مالیاتی، سیاسی اور تعلیمی موقف کو بلند کرنے میں جو عظیم الشان حصہ لیا ہے وہ بجائے خود ایک علحدہ ضخیم کتاب کا موضوع ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر نے مختلف مالیاتی، تعلیمی اور ادبی تحریکات کی دور رس قیادت فرمائی ہے خاص کر جامعۂ عثمانیہ کی ترقیات میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ ہم نواب صاحب موصوف کی خدمت میں ان کی خطاب یابی پر مودبانہ ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔

## آئینی تغیر

آنریبل سر نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات کی سفارش پر حکومت نے نائب معین امیر جامعہ کے عہدہ میں آئینی تغیر کر کے ایک ہمہ وقتی معین امیر جامعہ کا عہدہ قائم کیا ہے جس پر ملک کے نامور اولو العزم ذہین اور الطباع ماہر تعلیم عالیجناب سید محمد اعظم صاحب کا تقرر فرمایا گیا ہے۔ اعظم صاحب کی شخصیت ہمہ گیری اور جامعیت کے باعث عظمت و بلندی کی حامل ہے اور قبولیت عامہ کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ ان کے تقرر پر طلبا، اور بہی خواہان جامعہ

طمانیت محسوس کر رہے ہیں۔ صاحب موصوف کا انتخاب فی الحقیقت جامعہ عثمانیہ کے نظم ونسق کی تاریخ میں ایک نقطۂ انقلاب ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جناب اعظم صاحب جامعۂ عثمانیہ کے معمار اعظم اور عثمانین کے مفادات کے جلیل القدر محافظ ثابت ہوں گے۔ ہم اپنے نئے معین امیر جامعہ کو نیک توقعات اور پرخلوص تمناؤں کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہیں ؎

اے آمدنت باعث آبادی ما

## صدر المہام تعمیرات

**نواب زین یار جنگ بہادر**

جامعۂ عثمانیہ کے عظیم المرتبت تعمیر کار ——— نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات مقرر فرمائے گئے ہیں۔ نواب صاحب ملک کے بہت بڑے انجنیر ہیں۔ ان کی فنی بصیرت کی شہرت حیدرآباد اور ہندوستان کے حدود سے نکل کر دور دور تک پہنچ گئی ہے۔ انھوں نے عمارات میں قوموں کے تمدن کو مجسم کرکے تہذیب و ثقافت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے جامعۂ عثمانیہ کی عمارات ملاحظہ کیجئے یا علامہ اقبالؒ کے مقبرہ کا خاکہ آپ ان کے پس منظر میں قوموں کے تمدنوں کو محفوظ پائیں گے۔ نواب صاحب کی طرز تعمیر میں انفرادیت کے ساتھ ایک ایسی اشاریت پائی جاتی ہے جو بنی نوع انسان میں اتحاد وارتباط، اخوت و مساوات، نیکی و بلندی اور اخلاق و روحانیت کے جذبات کو حرکت میں لاتی ہے۔ علاوہ بریں نواب صاحب موصوف کی تعمیر کاری کے نمونے جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں ان میں ایک خاص کشش ایک خاص پاکیزگی ایک خاص حسن پایا جاتا ہے۔

نواب زین یار جنگ بہادر کی خدمت گرامی میں اس تعلق خاطر کی بناء پر جو انھیں جامعۂ عثمانیہ اور اردو زبان سے ہے ہم ان کی بارگاہ خسروی سے سرفرازی پر پرخلوص ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس اعتماد کا اظہار کرتے ہیں کہ موصوف کی مدبرانہ رہنمائی سے محکمۂ تعمیرات کے ارتقائی موقف کو غیر معمولی تقویت پہنچے گی۔

## عظیم ترین المیہ

حیدرآباد کے مایۂ ناز قائد مولوی محمد بہادر خاںؒ کی ہستی ایک ربانی تجلی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی —— وہ دل جو قوم کی درماندگی پر رہ رہ کر تڑپ اٹھتا تھا ساکت ہوگیا، وہ دست و بازو جن میں انسانی قیادت کا بارِ گراں اٹھانے کی بے پناہ قوت تھی توانائی سے محروم ہوگئے، وہ آنکھیں جو عزم و ایقان کا نور برساتی تھیں بے نور ہوگئیں، وہ زبان جو فصاحت کا دریا بہاتی تھی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ لیکن وہ روح پرفتوح جو ایک خاص مقصد کے لئے تخلیق کی گئی تھی اب بھی اپنے نصب العین کے حصول کے لئے سرگرم کار ہے —— قائد کا پیغام اتحاد و اتفاق کا پیغام ہے، نظم و ضبط کا پیغام ہے، آزاد حیدرآباد کا پیغام ہے جو یقیناً بلا تفریق مذہب و ملت سب کے لئے ہے —— قائد کی موت! —— آہ!! —— ایک عظیم ترین المیہ!!!

## حرفِ آخر

زیرِ نظر مجلّہ ہماری ادارت کا آخری شمارہ ہے۔ ہم نے اپنے فرائض سے بطریقِ احسن عہدہ برا ہونے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مجلس مشاورت مجلہ نے ہمارے ذوقِ کار اور جذبۂ عمل کی ستائش کی۔ ہم نے گوناگوں موانعات کے باوجود تین جداگانہ شمارے پیش کیے۔ کام خود اپنا آپ صلہ ہے۔ ہم مطمئن رخصت ہورہے ہیں۔ جاتے ہوئے ہم جدید منتخب مجلس ادارت کا پرخلوص خیر مقدم کرتے ہیں۔ جدید مجلس ادارت میں جناب مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے متعلم پی ایچ ڈی مہتمم مدیر منتخب کیے گئے ہیں۔ رفعت صاحب ہماری جامعہ کے ایک ممتاز سپوت ہیں۔ علم و ادب کی خدمت کا بے پناہ ولولہ رکھتے ہیں۔ بہت اچھے مقالہ نگار اور مشاق مترجم ہیں۔ اورینٹل کانفرنس بنارس اور ہسٹری کانفرنس اسلامیہ کالج پشاور میں عثمانین کی کامیاب نمایندگی کی ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند اور دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد کے قلمی معاون ہیں۔ ان کی مطبوعات میں مختصر تاریخ تمدن، ہماری غذا، مقالات جمال الدین افغانی

(فارسی مقالات کا ترجمہ) اور مشاہیر کی بیویاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں علاوہ بریں صاحب موصوف الموسی کے مدیر بھی رہ چکے ہیں ہمیں قوی توقع ہے کہ رفعت صاحب کے دیرینہ تجربہ اور پاکیزہ ادبی مذاق کی بدولت مجلّہ کا موقف رفیع سے رفیع تر ہوگا۔

محمد علی نبیر ایم اے
مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو



# خطبۂ صدارت شعبۂ اُردو

## آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جبل پور

۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء

### معزز حاضرین ـــــ

صدارت شعبۂ تصنیف و تالیف اُردو کے فرائض سپرد کرکے ارباب کانفرنس نے مجھ کو جو عزت بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنا سہل ہے لیکن ان ذمہ داریوں کی بجا آوری آسان نہیں ہے جو اس سلسلہ میں مجھ پر عاید ہوگئی ہیں۔ اس لئے کہ دنیائے اُردو کے مسائل گذشتہ ربع صدی میں اتنے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ان کا سلجھانا روز بروز دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اور ملک کے سیاسی اور اُردو بولنے والوں کے ذہنی رجحانات کچھ ایسے ناخوشگوار اور بھیانک ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کو سنوارنے اور سلجھانے کی جتنی کوشش کی جاتی ہیں اتنی ہی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان کے اسباب یوں تو کئی ہیں لیکن بڑے سبب صرف دو ہیں۔

(۱) اُردو بولنے والوں کی غفلت و سہل انگاری۔ (۲) ناخدایانِ اُردو کی خودغرضی و غلط راہروی۔

یہ دونوں اسباب ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہیں کہ ان کو صحیح معنوں میں دو سمجھنا ہی نہ چاہئے۔ یہ اصل میں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ جو لوگ اپنی زبان اور ادب سے غفلت برتتے ہیں وہ ہرگز توقع نہیں رکھ سکتے کہ ان میں سے فرض شناس، بے لوث، اور مخلص خادم زبان و ادب پیدا ہوسکیں گے۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ خلوص و ایثار اور صحیح نقطۂ نظر لے کر اٹھے گا بھی تو وہ لوگ اس کو پنپنے نہ دیں گے جو محض اپنی عظمت و اقتدار کے مظاہروں کی خاطر زبان و ادب کے رہنما اور قائد بن بیٹھتے ہیں اور ان کی غافل قوم کی آنکھیں انکی سیاست اور اقتدار کی جلوہ گری سے چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ جب تک احتسابی قوتیں شل رہیں گی صحیح رہنمائی ممکن نہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ نیک نیت رہنما بھی رفتہ رفتہ رہزن بن جائیں۔

اس لئے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ اُردو بولنے والوں میں اپنی زبان اور ادب کی سچی محبت کا احساس

پیدا ہو۔ اور واقعی محسوس کریں کہ زبان اور ادب کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بننے یا بگڑنے سے کتنا گہرا تعلق ہے جب تک یہ احساس پیدا نہ ہوگا نہ زبان ہی ترقی کر سکے گی اور نہ اس کے بولنے والے۔ اور اس احساس کی صحت مند نشوونما دوسری زبانوں سے نفرت پیدا کرنے یا دوسری زبان کے ہمدردوں سے دشمنی مول لینے کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک تخریبی طریقہ ہے اور اگرچہ تخریبی کام بالعموم جوش و جذبہ کے تحت بآسانی کرائے جا سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے قیادت اور رہنمائی کا مرتبہ بھی جلد اور آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن نہ ایسی قیادت دیرپا ہوتی ہے اور نہ ایسے کام مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے ہمسایے کے باغ میں درخت اور کیاریاں سرسبز اور شاداب ہیں اور آپ کے باغ میں پھلوں اور پھولوں اور شادابی کی کمی ہے تو یہ کمی اس طرح دور نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے ہمسایہ کو گالیاں دیں اور اس کے درختوں اور روشوں پر پتھر پھینکیں بلکہ آپ کا باغ اسی وقت ہمسایے کے چمن سے ہمسری کر سکے گا جبکہ آپ اس کے لئے ویسی ہی مشقت و محنت کریں جیسی کہ وہ اپنے باغ کے لئے کرتا ہے پس اردو کے چمن کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ہندی یا بنگالی یا پنجابی زبانوں کی مخالفت اور انکی آبیاری کرنے والوں سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی ان ہی ذریعوں اور طریقوں کو سمجھیں اور سیکھیں جن سے یہ زبانیں بار آور ہو رہی ہیں۔

یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے اس کے بعض بہی خواہ تعمیری کی بجائے تفریبی اسالیب کا اختیار کر رہے ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ میں کبھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا تھا اور اندیشہ ہے کہ اگر ہم اسی ذہنیت کے ساتھ نشوونما حاصل کرتے ہیں تو ہماری زبان اور ادب کی مقبولیت بہت جلد ختم ہو جائے گی جو ہمارے صلح کل صوفیوں اور زندہ دل شاعروں اور آزاد مشرب ادیبوں کی وجہ سے ہندوستان کے اس وسیع براعظم کے دور و دراز کے علاقوں میں پیدا ہوئی تھی۔ اردو بولنے اور سمجھنے والے کشمیر سے لنکا تک اور بلوچستان سے آسام تک محض اسی لئے اب بھی مل جاتے ہیں کہ ان کے اسلاف نے صلح جویانہ مسلک اختیار کیا اور کبھی کسی مقامی یا دوسری زبان کی مخالفت نہیں کی حالانکہ اس زبان کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے کہ اس کے بولنے والے صاحبانِ تخت و تاج تھے اور ہر طرح کا سیاسی و سماجی اقتدار رکھتے تھے۔

عہد حاضر میں جبکہ ہر طرف انفرادی و اجتماعی آزادی کے چرچے ہیں اگر اردو کے مصنفین و مؤلفین ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیں گے جو اس کی دیرینہ روایات کے خلاف ہے اور جس پر اپنے حاکمانہ اقتدار کے زمانہ میں بھی ارباب اردو نے

عمل نہیں کیا تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا نتیجہ اردو کے حق میں مفید نہ ہوگا اور اہل اُردو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے بدنام ہو جائیں گے اور ہم میں سے بعض ایسے ہیں جو اب اردو کے نام یا اس کے رسم الخط کو پسند نہیں کرتے تو ہم انھیں کیونکر مجبور کرسکتے ہیں کہ وہ اس کو پسند کریں؟ اور اگر ایسے لوگ خود اُردو سے برگشتہ ہو کر دوسروں کو بھی اس سے برگشتہ کرانا چاہتے ہیں تو اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے اخباروں میں چند حقارت آمیز یا مخالفانہ مضامین لکھ کر یہ سمجھ لیں کہ ہم نے اپنی زبان کی بڑی خدمت کی اور مخالفوں کے خلاف اہل اردو میں نفرت پیدا کر کے کوئی خاص کامیابی حاصل کی۔

ایسے وقت میں سچے اور مخلص ہمدردان اُردو کا اصل کام تو یہ ہے کہ ان لاکھوں اردو بولنے والوں کو صحیح معنوں میں اردو دان بنانے کی کوشش کریں جو ارباب اردو کی غفلت و نادانی اور دوسروں کی دانائی کی بنا پر بہت جلد اردو دنیا سے علحدہ ہو سکیں گے۔ کیونکہ تقریباً ہر صوبے میں ایسے لاکھوں غریب اور پریشان حال موجود ہیں جو پڑھنے لکھنے کی دولت سے محروم ہیں اگر اہل اردو چاہتے اگر ان کی زبان بولنے والوں کی مستقبل قریب میں کمی نہ ہونے پائے تو ان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز کریں۔ اگر ہندی کے بہی خواہ ان پڑھوں کو ہندی رسم الخط میں پڑھنا لکھنا سکھا کر اپنی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں تو وہ نہ صرف اپنا فرض ادا کر رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی شہرآفاق ناخواندگی کو دور کرنے کی سعی کر کے اپنے ملک کے سچے محسنوں کی صف میں شامل ہو رہے ہیں۔

تعلیم بالغان کی مہم بجائے خود جو اہمیت رکھتی ہے اس کی نسبت تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس کام سے ہم دوگونہ فوائد حاصل کریں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اس طرح تعلیم کو عام کر کے ہم جہالت کی ان گھنگھور گھٹاؤں کو دور کرسکیں گے جو ہمارے ملک پر چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں۔ اور جن کی تاریکی میں ہمارے کروڑوں بھائی بھلے اور برے اور سچ و جھوٹ کے مابین امتیاز نہیں کرسکتے اور اسی لئے وہ آسانی سے ایسے غلط بیانات باور کرسکتے ہیں کہ اُردو قرآن شریف کی زبان ہے اور اس کو مسلمان حملہ آور اپنی تلوار کے ساتھ باہر سے ہندوستان میں لے آئے ہیں۔

تعلیم بالغان کا دوسرا فائدہ پہلے فائدے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ ہماری اس مہم کے ساتھ ساتھ خود اردو کی اشاعت ہوتی جائے گی۔ ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری زبان کی بقا اور اشاعت کے سلسلہ میں فی الوقت تعلیم بالغان کو جو اہمیت حاصل ہے اتنی کسی اور مسئلہ کو حاصل نہیں۔ ان پڑھ لوگوں کو اس وقت جس

زبان میں بھی پڑھنا لکھنا سکھادیا جائے گا ان کی اولاد بھی وہی زبان اختیار کرے گی خاصکر صوبہ متحدہ اور صوبہ متوسط اوران کے اطراف واکناف اکثر علاقوں کے باشندے ایسی زبان یا بولیاں بولتے ہیں جو محض رسم الخط سیکھنے کے بعد یا تو اُردو بن جاتی ہیں یا ہندی ۔ اس لئے سب سے پہلے یا سب سے زیادہ کوشش انہی مقامات پر تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ہونی ضروری ہے لیکن افسوس ہے کہ انہی علاقوں میں اردو کی تعلیم بالغان سے غفلت برتی جارہی ہے اور ہمدردیٔ اُردو کے سارے مظاہرے نمود ونمایش اور مجلس آرائی کی حدتک آکر ختم ہوجاتے ہیں ۔ جو لوگ اردو کی محبت کے دعوہ دار ہیں اور اردو کے ساتھ اپنی تمدنی اور سماجی بہبودی کے بھی خواہشمند ہیں انھیں چاہیئے کہ اپنے اپنے قریوں، محلوں، گلیوں اور بازاروں میں تعلیم بالغان کے مدارس شبینہ کھولیں اور متحدہ طور پر سعی کریں کہ ان کے گاؤں محلے یا گلی میں کوئی شخص ایسا نہ رہے کہ جس کو اُردو پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو ۔ اور اگر متحد ہوکر کام کرنا کسی وجہ سے ناممکن ہو (جس کا امکان زیادہ ہے) تو ہر شخص انفرادی طور پر کوشش کرے کہ وہ سال بھر میں کم از کم ایک مرد یا عورت کو پڑھا لکھا بنا کر چھوڑے گا ۔ اردو کے ہر پڑھے لکھے آدمی کا یہ ایک مقدس فریضہ ہے جس کی بجاآوری کے بغیر اس کا ضمیر مطئین نہیں ہوسکتا ۔

یہ کام مشکل بھی نہیں ہے اور اس کے لئے نہ کسی انجمن کی ضرورت ہے نہ چندوں کی اور نہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کی لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری طبیعتیں ایسے ہی کاموں میں لگتی ہیں جن میں انجمن آرائی ہو یا ہنگامہ پروری ۔ ہم خاموش اور مخلص کام کے ابھی عادی نہیں ہوئے ہیں اسی لئے جو لوگ خاموشی اور خلوص و ایثار کے ساتھ اپنی زبان کی ترقی اور اشاعت کررہے ہیں وہ برق رفتاری کے ساتھ ہم سے آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں ۔

خوش قسمتی سے ہم میں مولوی محمد سجاد مرزا صاحب جیسے ماہرین تعلیم موجود ہیں جنھوں نے تجربوں اور معلومات کے بعد تعلیم بالغان کی آسان کتابیں اپنی ذاتی نگرانی میں مرتب کرائی ہیں اور جن کو عملی تجربہ کی خاطر ادارۂ ادبیات اُردو نے اپنی تعلیم بالغان کی مہم میں استعمال کرکے اندازہ لگایا ہے کہ ہندوستان کے ہر علاقہ میں ان پڑھوں کو بہت جلد پڑھا لکھا بنایا جاسکتا ہے ۔ یہ کتابیں نہ صرف حیدرآباد بلکہ میسور اور جوناگڑھ کی ریاستوں اور بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں بھی روشناس ہوئیں اور تعلیم بالغان کے لئے مفید اور مقبول سمجھی جارہی ہیں ۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی ان کے ذریعہ سے کسی ان پڑھ آدمی کو اُردو نوشت وخواند سے واقف کراسکتا ہے ۔ چنانچہ جہاں جہاں ادارۂ ادبیات اُردو نے اس نصاب کو روشناس کیا بیسیوں ان پڑھ لوگ پڑھے لکھے بن گئے ۔ اور ادارے کے اردو امتحانات میں شریک

ہوکر کامیابی حاصل کی۔ ادارے کی تعلیم بالغان کی مہم اتنی کامیاب ثابت ہوئی ہے کہ ۱۹۴۳ء میں ریاست کے تقریباً دو ہزار ان پڑھوں نے اس کے امتحان اردو دانی میں شریک ہوکر کامیابی حاصل کی۔ اور اس امتحان کے مرکز ریاست حیدرآباد کے باہر بھی مقرر کرنے پڑے چنانچہ گذشتہ سال بمبئی جیسا بڑا شہر بھی ایک مرکز تھا۔

غرض اس تجربہ سے ثابت ہوا کہ اردو میں تعلیم بالغان کا کام نہایت آسانی سے انجام پا سکتا ہے۔ اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے رہنے بسنے والے اگر توجہ کریں تو نہ صرف اپنے علاقے سے ناخواندگی کی وبا کو دور کرسکتے ہیں بلکہ اہل اردو کی تعداد میں اضافے کا باعث اور اپنی زبان کے استحکام و اشاعت کا موجب بھی بن سکتے ہیں۔

اُردو کی تقویت اور استحکام کا ایک دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اہل اردو مطالعہ کی عادت ڈالیں۔ مطالعہ کے گوناگوں فوائد سے یوں تو کسی کو انکار نہ ہوگا۔ لیکن عہد حاضر میں اردو کی بقا اور ترقی کے لئے یہ ایک زود اثر اور مفید تر حربہ ثابت ہوسکتا ہے۔

اگر کوئی غیبی طاقت ہر اردو پڑھے لکھے مرد یا عورت کو اس امر کے التزام پر مجبور کرے کہ وہ روزانہ تھوڑی دیر (دس پانچ منٹ ہی سہی) کسی نہ کسی کتاب یا اخبار کا کچھ حصہ پڑھ لیا کرے تو اردو تصنیف و تالیف کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہوسکتا ہے۔ لیکن ہر کس و ناکس سے ایک ایسے التزام کی توقع نہیں کی جاسکتی اس لئے ایک ایسے انقلاب کی امید رکھنا بھی فضول ہے۔ البتہ سمجھ بوجھ رکھنے والے جملہ بہی خواہانِ اردو کو کوشش کرنی چاہیے کہ خود ہی اس امر کا التزام کریں اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس ذوق کو پھیلائیں۔ وہ دن اردو ادب کیلئے بڑا مبارک دن ہوگا جب اردو بولنے والوں کے ہر محلہ اور ہر گلی میں ایک کتب خانہ یا دارالمطالعہ موجود رہے گا۔ لیکن ایک ایسا یوم عید اس وقت تک نہ آئے گا جب تک کہ اردو بولنے والوں میں اتحاد اور صحیح قسم کا سیاسی شعور نہ پیدا ہوگا اور انکی معاشی پستی دور نہ ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ حالات کے تحت ہر گلی میں ایک باضابطہ دارالمطالعہ قائم نہ ہوسکے۔ ایسی حالت میں ایک عملی صورت یہ اختیار کی جاسکتی ہے کہ اپنے محلہ یا گلی کے کسی ایک گھر کو منتخب کرکے اس میں دو چار اخبار اور رسالے اور چند کتابیں مطالعہ کے لئے جمع کرلی جائیں اور فرصت کے اوقات میں پڑھے لکھے لوگ وہاں جایا کریں۔ مسجدوں اور معبدوں سے بھی یہ کام بڑی خوبی سے لیا جاسکتا ہے۔

بہرحال جہاں اور جس طرح بن پڑے دارالمطالعے قائم کئے جائیں اور پڑھے لکھے لوگ اپنی زبان کے ادب سے

استفادہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں ایک طرف اردو ادب کا ذوق عام ہوگا دوسری طرف اُردو کے اخبار، رسالے اور تصنیفات و تالیفات زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھپیں گا اور ان کے مصنفوں، مرتبوں اور ناشروں کی ہمت افزائی اور امداد ہوگی۔ جو اصحاب اردو اخبارات و رسائل کی کم مانگ اور کتب کی بے رونقی اور گھٹیا معیار کی شکایت کرتے ہیں وہ کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس کا سبب وہ خود ہیں۔ جب تک اردو کی مطبوعات زیادہ تعداد میں صرف نہ ہونگی نہ ان کے مصنفوں اور ناشروں کو بہتر بنانے اور چھپانے کی ہمت ہوگی اور نہ ان کی قیمتیں کم ہوسکیں گی۔ طلب اور رسد کا یہ ایک ایسا موٹا مسئلہ ہے جس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔ کتنے رنج کا مقام ہے کہ جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد فخر و مباہات کے ساتھ آٹھ دس کروڑ سے زیادہ بتائی جاتی ہے اس کا کوئی اخبار یا رسالہ پانچ ہزار سے زیادہ تعداد میں نہیں چھپ سکتا۔ اور اس کی کسی مفید سے مفید کتاب کے بھی ہزار دو ہزار سے زیادہ نسخے شایع ہونے نہیں پاتے۔ اہل اُردو کے لیے یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ اس کے اکثر رسالوں کے مدیر اپنے مضمون نگاروں کو کوئی معاوضہ نہیں دے سکتے۔ معاوضہ دینا تو درکنار اکثر و بیشتر رسائل ایسے ہیں جو کاغذ و طباعت ہی کے اخراجات کو ترستے رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں مضامین کے معیار میں اضافہ اور رسائل کی ترتیب و دیدہ زیبی میں ترقی کیوں کر ممکن ہے۔ کسی زبان کی پستی اور اہل زبان کی بے دردی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ ہم کو دوسری ہمسایہ زبانوں اور ان کے بہی خواہوں پر اعتراض کرنے کا کیا حق حاصل ہے جب کہ ہم خود اپنی زبان اور ادب سے غافل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری زبان کو ہماری اس بے حسی اور کم شعوری سے جتنا نقصان پہنچ رہا ہے دوسروں کی معاندانہ سرگرمیوں سے کبھی نہیں پہنچ سکتا ایسے ہی مواقع کے لئے شاید کہا گیا تھا کہ از ماست کہ بر ماست۔

ہماری زبان کے ادیب اور شاعر اپنی ذہانت، محنت اور فن کارانہ کمال میں بڑی سے بڑی اور مہذب ترین زبان کے ادیبوں اور شاعروں سے کسی طرح کم نہیں لیکن جس زبان کے بولنے والے خواہ امیر ہوں کہ غریب، بلکہ غریبوں سے زیادہ امیر قدر دانی کے فن سے عاری اور ادبی ذوق سے بے بہرہ ہوں اس میں علم و فن اور شعر و ادب پروان چڑھے تو کیونکر۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صاحبانِ علم اردو کی جگہ انگریزی اور ہندی میں لکھنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ جب ہم میں سے اکثروں کی ذہنیت کا یہ عالم ہو کہ ہم انگریزی

زبان میں چھپی ہوئی تحریر کو زیادہ مستند اور دلچسپ سمجھتے ہیں تو پھر اردو میں کون لکھے گا۔ یہ ایک میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپتی ہے تو لوگ اس کے انگریزی نسخہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اردو نسخہ دوسری اردو کتابوں کی طرح برسوں طاق نسیاں میں دھرا رہتا ہے اور بے چارے مصنف کو پھر کبھی کوئی کتاب اردو میں چھپوانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ غرض جب اپنے شاعروں اور ادیبوں کی خود ہم قدر نہ کریں گے تو دوسرے ان کی طرف کیوں متوجہ ہوں پھر ہم کیوں توقع رکھیں کہ ترکی کے صحیفہ نگار سیاح' یا ایرانی ثقافتی وفد کے ارکان بنگالی کے شاعر ٹیگور کے مقابلے میں اردو کے شاعر اقبال سے زیادہ واقف ہوں گے۔

اس لئے اردو کے تمام ہمدردوں کو تہیہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ اردو کتب و رسائل کی خریدی کے لئے ہر مہینے لازمی طور پر خرچ کریں گے۔ اگر دس کروڑ سے زیادہ انسانوں میں بولی جانے والی زبان میں دس لاکھ آدمی بھی ایسے نہ مل سکیں جو اپنی زبان کی کتابوں اور رسالوں کو پابندی اور شوق سے خریدتے ہوں اور دس بارہ صاحبان مقدرت ایسے مہیا نہ ہو سکیں جو اردو تصنیفات و تالیفات پر انعام و اکرام دینے اور اردو کے ارباب قلم کی شایان شان سرپرستی کرنے کا ارادہ نہ کر سکیں تو پھر کثرت تعداد پر فخر کرنے اور اپنی زبان کی فضیلت و وسعت جتانے سے کیا فائدہ؟ اہل اردو کو اس کا قلق ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ کچھ لوگ اردو چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اصل غم تو اس کا ہے کہ جو لوگ اردو کو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتے وہ اس زبان کا کوئی درد نہیں رکھتے۔ اگر ہم جانے والوں سے جھگڑنے کی جگہ رہنے والوں کو صحیح معنوں میں زندہ اور اردو ادب کے دلدادہ بنا دیں تو پھر ہم کو نہ انگریزی سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہندی یا پنجابی سے۔

غرض جس طرح ان پڑھوں کے لئے تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز ہمارے اولین فرائض میں داخل ہے اسی طرح پڑھے لکھے لوگوں کے لئے دار المطالعوں کے قیام اور نتیجتاً اردو ادب کے اشاعت کی بھی ایک علحدہ مہم جاری کرنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ اور یہ دونوں کام ایسے بھی نہیں ہیں جو کسی بڑی تنظیم یا سرمایہ کے بغیر نہ چل سکیں گے۔ ہر بہی خواہ اردو بحالت مجبوری انفرادی طور پر ہی ان کو آسانی سے چلا سکتا ہے۔ اور اگر ان کی خاطر ملک کے مختلف حصوں میں اجتماعی طور پر کام شروع ہو سکے تو اردو زبان کی اس سے بڑھ کر

خوش قسمتی عہد حاضر میں اور کوئی نہیں ہو سکتی ۔

اُردو تصنیف و تالیف کی ایک نمایاں بدقسمتی جس کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا تھا یہ ہے کہ عوام کی بے حسی اور ناقدری کے ساتھ بعض خاصان ادب میں بھی ایسی خرابیاں نمودار ہوگئی ہیں جو زبان کی ترقی اور ادب کے نشوونما کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتی ہیں۔ جو مصنفین و مولفین بخت و اتفاق سے کسی مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ دوسرے بھی اس درجہ تک پہنچنے کے اہل ثابت ہوں۔ جس طرح میں نے آج سے چار سال قبل فروری ۱۹۴۱ء میں جامعۂ عثمانیہ کی اردو کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا "اب زمانہ بدل رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی ٹھیکے بھی ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان ٹھیکہ داروں کی ذہنیت کے بدلنے میں ابھی کچھ عرصہ درکار ہو۔ لیکن اردو کے جواں ہمت خدمت گزاروں کو بددل نہ ہونا چاہئے۔ ان کے آگے وسیع میدان ہے اگر وہ چاہیں تو اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ بوسیدہ مزاروں کے ان سجادہ نشینوں کے ظاہری یا باطنی فیوض کے بغیر ہی اپنی ذاتی کدوکاوش سے اپنے ویرانوں میں چراغاں کر سکتے ہیں"۔

ایک طرف پختہ مشق ادیبوں کی علمی امارت اور سرمایہ داری کی ذہنیت بڑھتی جارہی ہے اور دوسری طرف عدم احتساب اور اہل زبان کی کم شعوری کے باعث اردو کا ہر طفل مکتب خود کو ایک بڑا ادیب اور شاعر سمجھنے لگا ہے۔ گویا اردو ادب کی دنیا آج ایک ایسی لنکا بنی ہوئی ہے جس میں ہر شخص باؤن گز کا ہے۔ جس محفل میں نہ بڑوں کو چھوٹوں کا خیال رہے اور نہ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ تو اس کے بگڑنے اور اجڑنے کا انتظار ہی بیکار ہے ۔

ایک اور عیب جس نے اس زبان کی تصنیف و تالیف میں شروع ہی سے کانٹے بور کھے ہیں صوبہ جاتی تعصب ہے۔ اگرچہ تعصب خواہ وہ کسی قسم کا ہو معیوب ہے لیکن علمی و ادبی فضا میں تو وہ سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو صرف دلی اور لکھنؤ والے ہی اس تفاخر میں مست تھے اور دوسرے صوبوں کی اردو کو اردو ہی نہیں ماننا چاہتے تھے۔ لیکن اب تو اکثر اردو بولنے والے علاقوں میں تعصب کا بازار گرم ہے۔ اور ہر جگہ روز بروز جتھابندی بڑھتی جارہی ہے۔ چنانچہ بعض صوبوں میں منظم جتھ بندی کیجاتی ہے کہ خواہ ذوق و انصاف کا خون ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے علاقہ کے شاعر اور ادیب کے مقابلے میں دوسرے مقام کے صاحبانِ کمال کو ترجیح نہ حاصل ہونے پائے۔ اس رجحان سے اردو کی ہمہ گیری کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔ اور ایک ایسی بھیانک فضا چھا جائے گی جس میں کمال فن و اجمال ادب کے

جلوے شاید ہی نمودار ہو سکیں۔ جو لوگ دوسروں سے بحث کرتے وقت دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو اہل ہند کی ایک مشترکہ میراث ہے اور اپنی اعلیٰ خصوصیات کے باعث ہندوستان کی عام زبان کہلانے کا حق اسی کو حاصل ہے انھیں چاہیے کہ ذرا اپنے دامن کو بھی دیکھیں اور ان درون خانہ جھگڑوں کو جلد سے جلد محسوس کرکے صوبہ واری تعصبات کا فراغ دلی کے ساتھ سد باب کریں۔

اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو زبان و ادب اردو کی تشکیل و ارتقا میں ہندوستان کے اکثر و بیشتر علاقوں نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا اپنی زبان کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے۔ پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے غزنوی سلطنت کے زمانے میں اردو کا بیج بویا۔ جب دلی میں ترک غلاموں کی سلطنت قایم ہوئی تو علاقہ برج (یعنے آگرہ۔ گوالیار اور دلی) کی زبان اور تہذیب نے اس کی آبیاری کی پھر گجرات کے مظفر شاہی اور دکن کی بہمنی (اور بعد کو اس کی جانشین قطب شاہی اور عادل شاہی) سلطنتوں نے پنجاب اور دوآبہ گنگ و جمن کے اس پودے کی ایسی اچھی پرداخت کی کہ اس میں پھول اور پھل نکل آئے۔ اور احمد آباد، گولکنڈہ، اور بیجاپور اردو ادب کے ابتدائی گہوارے کہلائے۔

عہد اورنگ زیب تک شمالی ہند میں اردو صرف بازاروں اور لشکروں کی عام بول چال کی زبان رہی لیکن اورنگ آباد کے ایک زندہ دل شاعر ولی کی کرامت نے شاہ جہاں آباد کے شاعروں سے فارسی گوئی ترک کرا کے ان کو اردو کا گرویدہ بنا دیا۔ جب دلی والوں نے اس زبان کو ادب کے لئے استعمال کرنا شروع کیا تو اس نے رفتہ رفتہ ایک ایسی معیاری زبان کی شکل اختیار کرلی کہ بعد کو خود گجرات اور دکن والے بھی اپنا قدیم اسلوب چھوڑ کر اسی کی تقلید پر مجبور ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب شعرائے دہلی اس معیاری زبان کو لے کر شرقی ہندوستان پہنچے تو اودھ بہار و بنگالہ کے صاحبان ذوق نے اپنی مقامی زبانوں کی جگہ اسی کو اپنی ادیبانہ قوتوں کے مظاہرے کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اودھ اور بہار اسنہ کی سرزمینوں سے اردو کے بڑے بڑے صاحبان کمال اٹھے۔ فیض آباد، لکھنو، پٹنہ، اور مرشد آباد اردو کے وہ مرکز ہیں جن کے تذکرہ کے بغیر ادب اردو کی کوئی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔ خاص کر اردو شاعری کا دامن وہاں شعرا نے ایسے گلہائے رنگارنگ سے بھر دیا جنکی شگفتگی ہمیشہ باقی رہے گی۔

برطانوی راج کے آغاز کے بعد جب ہندوستان کے علوم وفنون نے نشاۃ ثانیہ حاصل کی تو دوبارہ پنجاب اور دکن ہی نے گیسوئے اردو کے سنوارنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ پنجاب میں جدید اُردو ادب نے جنم لیا اور آزاد اور حالی جیسے باکمالوں کے دماغ وہیں جدید شاعری اور جدید نثر کے سانچوں سے روشناس ہوئے۔ ساتھ ہی حیدرآباد میں پہلے نواب شمس الامرا کی اور بعد کو جامعۂ عثمانیہ کی سرپرستی میں اردو کا خزانہ مغربی علوم وفنون خاص کر سائنس کے مضامین سے مالا مال ہوگیا۔ ادہر سر سید احمد خاں نے دلی اور پھر علی گڑھ میں ہماری زبان کو انگریزی کا ہم پلہ بنانے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کو ان کے طاحب کمال ساتھیوں نے اس خوبی سے نبھایا کہ اُردو واقعی ایک مہذب زبان بن گئی اور اس کا شمار دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں کیا جانے لگا۔

عہد حاضر میں بھی اردو زبان وادب کی جو اجتماعی وانفرادی خدمات انجام دی جارہی ہیں وہ بھی کسی ایک خطۂ ملک تک محدود نہیں ہیں۔ یہ اردو کی ہمہ گیری کا ایک نمایاں ثبوت ہے کہ اس کے ارتقا میں ہندوستان کے اکثر وبیشتر صوبوں کے باشندے اب بھی اپنے طور پر برابر سرگرم عمل ہیں۔ اور یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو ہندوستان کی کسی اور زبان کو خواہ وہ اردو کی حریف مقابل ہی کیوں نہ ہو نصیب نہیں ہوسکتی۔

اردو کی اجتماعی خدمات میں سب سے پہلے جامعۂ عثمانیہ اور اس کے دارالترجمہ کا ذکر ضروری ہے یہ جامعہ سلطان العلوم اعلیٰ حضرت آصف جاہِ سابع کی مسیحا نفسی کا ایک ایسا کرشمہ ہے جس نے ہماری زبان کے علم وفضل اور ہمارے مفاخر ومباہات میں چار چاند لگا دیے۔ جامعۂ عثمانیہ ایک ایسا آفتاب ہے جس کی ضو پاشیوں سے اردو کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس لئے میں اس جامعہ سے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں

جامعۂ عثمانیہ کے بعد انجمن ترقی اُردو ہماری زبان کی وہ واحد انجمن ہے جس کی طرف ہر خطۂ ملک کے اردو والوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ انجمن نہ صرف اپنی قدامت بلکہ اپنے وسائل کے لحاظ سے بھی اردو کی دوسری انجمنوں اور اداروں پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس نے اردو شاعروں کے تذکرے اور مختلف فنون کی اصطلاحات اور لغت شائع کرکے اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ اسی کل ہند اسلامی تعلیمی کانفرنس کے شعبۂ تصنیف وتالیف اردو کی حیثیت سے اس کا آغاز ہوا۔ اور اس کو علامہ شبلی۔ مولانا حبیب الرحمن خاں صدر یار جنگ بہادر شیروانی۔ مولوی عزیز مرزا۔ اور مولوی ڈاکٹر عبدالحق جیسے فاضل اور سرگرم عمل معتمد نصیب ہوئے اگرچہ کانفرنس کے اس شعبے نے بڑھ کر انجمن ترقی اُردو

کی ایک جداگانہ شکل اختیار کرلی لیکن بڑی مسرت کا مقام ہے کہ اس کانفرنس نے اپنے اس شعبہ کو بھی برابر قایم رکھا چنانچہ آجکل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے صاحب ذوق اس کے معتمد ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر صاحب ہی کی نگرانی میں علی گڈھ کی مشہور قدیم انجمن اردوئے معلیٰ بھی اب تک سرگرم عمل ہے اور علی گڈھ کی وہ قدیم علمی وادبی روایات بھی برقرار ہیں جن پر اُردو دنیا جتنا فخر کرے کم ہے۔

اُردو کی دوسری اجتماعی خدمات میں دار المصنفین اعظم گڈھ، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد اور مجلس مصنفین علی گڈھ خاصکر قابل ذکر ہیں۔ دار المصنفین علامہ شبلی کی ایک صحیح یادگار ہے اور اس کے کارکن اس مستحسن روش پر چلنا اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں جو اردو کے اس بڑے ادیب اور مورخ نے اختیار کی تھی شبلی کے جانشینوں کو تاریخ وعلوم اسلامی کا اچھا اور پختہ ذوق حاصل ہے لیکن شبلی کا وہ دلچسپ اسلوب بیان ان کو ورثہ میں مل سکا جس کے باعث شبلی نہ صرف ایک اعلیٰ مورخ اور سوانح نگار ہیں بلکہ اردو کے ان چوٹی کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے اس زبان کو اپنے پر شوکت اور رنگین اسلوب بیان کی وجہ ایک ایسی ہمہ گیری بخشی کہ یہ زبان اب ہر خطہ ملک کے لکھنے والوں کے لئے آسان بن گئی اس جماعت کے روح رواں مولانا سید سلیمان ندوی نے حال ہی میں حیات شبلی شائع کرکے مولانا حالی کی وہ فضیلت چھین لی جو ان کو حیات جاوید لکھنے کے بعد اردو ادب میں حاصل تھی۔

ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ کی حکومت کی اس خواہش کی بناء پر قائم ہوئی تھی کہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تصنیف وتالیف کا مفید کام ہو سکے لیکن کچھ تو حکومتی اور سیاسی الجھنوں کی بنا پر اور کچھ اس وجہ سے کہ اس تنظیم کے پیچھے اردو کے کسی بڑے ادیب اور مخلص رہنما کا سہارا نہ تھا یہ کیڈیمی ارباب اردو کی توقعات کے مطابق کامیاب ثابت نہ ہو سکی اگرچہ حکومت نے اس کے تماہی رسالے کے ادارات یکے بعد دیگرے کئی قابل اصحاب کے سپرد کی اور اس کی مجلس منتظمہ میں بعض لائق لوگوں کو بھی شریک رکھا۔ پھر بھی تصنیف وتالیف کا جو کچھ کام ہوا ہے ایک حد تک غنیمت ہے اور توقع ہے کہ آیندہ اس سے بہتر کام ہو سکے گا۔

ادارۂ ادبیات اُردو بھی تقریباً اسی زمانہ میں قائم ہوا جس زمانہ میں ہندوستانی اکیڈیمی قائم ہوئی تھی۔ لیکن یہ ایک بالکل خانگی ادارہ ہے اور اس کے بانیوں نے حکومت یا عوام کے آگے امداد کیلئے دست طلب دراز کئے بغیر اپنے کام کا آغاز کردیا۔ اور کٹھن سے کٹھن گھڑیوں میں بھی ہمت واستقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اسی لئے اسکی

جانب سے ما ناموں کے علاوہ اب تک سو اسو سے زیادہ تاریخی و ادبی کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور کچھ عرصے سے وہ ایک مخزن علوم وفنون یعنی اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب میں بھی مصروف ہے جس کی پہلی جلد چھپ رہی ہے ۔ اس ادارے نے تعلیم بالغان کی جس مہم کا آغاز کیا اس کا ذکر اس سے قبل گذر چکا ہے ۔

ادارۂ ادبیات اردو نے جس چھوٹے پیمانے پر خلوص وخاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا تھا اسی طرح دو سال قبل علیگڈھ میں مجلس مصنفین نے اردو کی خدمت کا آغاز کیا ہے ۔ اس کے لائق اور مخلص معتمد مولوی الطاف علی صاحب بریلوی بی اے ہیں ۔ جو اس مجلس کے ترجمان مجلۂ مصنف کے مدیر بھی ہیں ۔ یہ رسالہ ادب تاریخ کے ان بلند پایہ مقالوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اس مجلس کے جلسوں میں ہر ماہ پڑھے جاتے ہیں ۔ چونکہ یہ مجلس خلوص اور صحیح ذوق کے تحت کام رہی ہے اس لئے یقین ہے کہ اردو ادب کی اجتماعی خدمات کی تاریخ میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ مخصوص کرلے گی ۔

دہلی میں بھی ایک اردو مجلس خواجہ محمد شفیع صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر قایم ہوئی ہے جس کے اجلاس ہر مہینے منعقد ہوتے ہیں ۔ اور اس میں بھی اچھے مضامین اور نظمیں سنائی جاتی ہیں لیکن اس مجلس کی جانب سے کوئی کوئی رسالہ شایع نہیں ہوتا ۔ گذشتہ دو تین ماہ سے حیدرآباد میں بھی مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک ایسی ہی مجلس کا افتتاح کیا ہے ۔ اگر یہ مجلسیں یوں ہی خوش اسلوبی سے منعقد ہوتی رہیں اور ارباب ذوق اسی طرح ایک دوسرے سے استفادہ کرتے رہیں تو یقین ہے کہ اردو ادب کا اچھا ذوق پھیل سکے گا اور لوگوں میں اپنی زبان اور ادب کے مختلف مسائل سے دلچسپی پیدا ہوکر وہ غفلت دور کرسکے گی جس کی خرابیوں کی تفصیل اس سے قبل بیان ہو چکی ہے ۔

اجتماعی کوششوں کے سلسلہ میں سب سے آخر میں ترقی پسند مصنفین کی جماعت کا ذکر ضروری ہے اس جماعت کے افراد میں جو باغیانہ ذہنیت عام طور پر محسوس کیجا رہی ہے وہ دراصل ردعمل ہے اور اردو دانوں کے اس جمود و غفلت اور خاصان اردو کی اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کا جس کا تفصیلی تذکرہ میں پہلے کرچکا ہوں ۔ دنیائے اردو میں گذشتہ ربع صدی کے اندر جو مایوس کن فضا پیدا ہوگئی تھی میری نظر میں اس کا فطری اقتضا یہی تھا کہ ایک ایسی جماعت پیدا ہوتی جو اپنے ادب کے جملہ رجعت پسندانہ خصوصیات اور گونہ گوں جکڑبندیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مرض جتنا شدید ہوتا ہے اس کے علاج میں بھی اتنی ہی تلخ و تند دوائیں تجویز کرنی پڑتی ہیں ۔ اور شاید اسی خیال کے پیش نظر ترقی پسند ادیبوں نے اپنے لہجہ کو ترش و تیز بنانے کی کوشش کی لیکن ان میں بعض ایسے گم کردہ راہ اور

بر خود غلط نوجوان بھی شامل ہو گئے جنھوں نے اصل مقصد سے ہٹ کر یا تو اشتراکیت کی تبلیغ شروع کر دی یا فحش گوئی پر اتر آئے۔ یہ دونوں رجحانات اصل میں ہماری موجودہ معاشرت ہی کا نتیجہ ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ اردو بولنے والوں کے ذہن آج کل کس سیاسی اور سماجی بےچینی میں مبتلا ہیں۔ نیز ہمارے نوجوان اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے کس پست درجہ تک پہنچ چکے ہیں۔ غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک جاری ہوتے ہی کسی قید خانے سے اچھے اور برے ہر قسم کے قیدی اپنی اپنی زنجیروں کو توڑ کر باہر نکل آئے ہیں۔ جو بھلے ہیں وہ اس امر کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ خیال اور زبان آزاد ہو کر ادب اور زندگی کو وہ فائدہ پہنچا سکیں جو ہماری کم فہم سماج کی عائد کردہ جکڑ بندیوں کی وجہ سے بحالت موجودہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور جو برے ہیں انھیں ترقی پسندی کی آڑ میں اپنے گندگیوں کو پھیلانے کی آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ گویا ایک ایسا میلہ لگا ہوا ہے جس میں اوباشوں کی وجہ سے شریفوں کی بدنامی ہو رہی ہے اور شریفوں کا بھیس لے کر اوباش جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ ان دونوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے میں کچھ عرصہ درکار ہوگا اور جب یہ مجمع کچھ دن خوش فعلیاں کر چکے گا اور بروں کی برائیاں اور بھلوں کی بھلائیاں الگ الگ نظر آنے لگیں گی تو اس تحریک کی قدر و قیمت متعین ہو سکے گی۔ اور اگر اس کے چلانے والوں نے جرأت و استقلال کے ساتھ اعلیٰ کردار کا بھی مظاہرہ کیا تو امید ہے کہ موجودہ افراتفری کا سد باب ہو کر یہ تحریک صحیح معنوں میں ترقی پسند ثابت ہوگی اور اس سے اردو ادب کو فائدہ پہنچے گا ورنہ یقین ہے کہ تاریخ ادب اردو میں اس کو ایک ہنگامۂ نا و نوش سے بڑھ کر اہمیت حاصل نہ ہو سکے گی۔

ان چند اجتماعی تحریکوں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف اقطاع میں اور بھی انجمنیں اور جماعتیں اردو تصنیف و تالیف کی خدمت کر رہی ہیں۔ اور ان کے علاوہ بعض اصحاب ایسے بھی ہیں جو اگرچہ تنہا کام کر رہے ہیں لیکن بجائے خود ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سب کی اردو خدمات پر تبصرہ کرنے کی اس وقت ضرورت ہے اور نہ فرصت مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی بے بساطی اور مصروفیت کے باعث اس وقت بعض ایسے مسائل کی طرف بھی آپ حضرات کی توجہ منعطف نہ کرا سکا جن کی نسبت بعض صاحبان ذوق غور و خوض کر رہے ہیں مثلاً رسم الخط میں اصلاح۔ ٹیتھو کی جگہ ٹائپ کا انتخاب۔ اور زبان کی سلاست و سادگی وغیرہ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب تک جو کچھ سمع خراشی کی گئی ہے وہی ناگوار خاطر نہ ہوئی ہو لیکن اتنا یقین ہے کہ یہ صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی اور اردو کے مسئلہ کو ہم اپنا ذاتی معاملہ سمجھیں گے۔ اور جس طرح ہم اپنے ذاتی کام کو بہر صورت انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس امید پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے

نہیں رہتے کہ دوسرے دست تعاون دراز کریں گے تو ہم بھی اٹھیں گے اسی طرح اردو کے کام کے لئے بھی ہم میں سے ہر ایک تن تنہا میدان عمل میں نکل آئیگا۔ ہمیں اُردو کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لئے جس شخص سے جتنا بھی بن پڑے غنیمت ہے۔ اردو ہم سے صرف، اتنا ہی چاہتی ہے۔ وہ دنیا کی ان زبانوں میں سے ہے جن میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے۔ اور جو تمام مخالفتوں اور مصیبتوں کا خود ہی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے مقابلہ کرلیتی ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اسکی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور اپنی زندگی کو شگفتہ، تمدن کو پاکیزہ، اور قوم کو وسیع و مستحکم بنانے میں اپنی زبان کے مقبول عام اور ہمہ گیر اوصاف کو بطور حربہ استعمال کریں۔ ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اسلاف کے ورثہ میں ہمیں اردو کی صورت میں ایک ایسی عمدہ تلوار ملی ہے جس کے جوہر اتنے ہی زیادہ نمایاں ہوں گے جتنا زیادہ ہم اس کو استعمال کریں گے۔ اگر ہم اس کو میان ہی میں پڑے رہنے دیں اور سمجھ لیں کہ یہ خود بخود ہماری تہذیب وتمدن بلکہ ہمارے قومی وجود کی حفاظت کے لئے اٹھے گی تو ہم سے بڑھ کر کم فہم اور غافل کوئی نہیں ہوسکتا۔

زورؔ
سیّد محی الدین قادری

# حیدرآباد میں زرعی پیداوار کی فروخت

اس مضمون پر بزم معاشیات کی جانب سے پہلا انعام دیا گیا

قدیم زمانے میں جب کہ زراعت کا دائرہ نہایت محدود تھا۔ اور کاشتکار صرف مقامی ضروریات کے لئے ہر قسم کی ضروری فصلیں محدود پیمانے پر اگا لیتے تھے تو اس زمانے میں پیداوار کی فروخت کے لئے کسی باقاعدہ تنظیم کی ضرورت نہ تھی۔ کاشت کار اور صارف میں راست تعلق قایم تھا اور دیہات کی سیدھی سادھی تنظیم اس کے لئے بہت کافی تھی۔ لیکن گزشتہ صدی کے نصف آخر سے ہندوستان کے زرعی نظام میں بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ تجارتی فصلیں وسیع پیمانے پر اگائی جانے لگیں ملک کے مختلف علاقے موزونیت کے اعتبار سے خاص خاص فصلوں کے لئے مختص ہو گئے۔ نقل و حمل کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کے باعث زراعت کے دائرہ کو وسعت حاصل ہوئی' بازار بھی وسیع ہو گئے اور مقابلے کا دور دورہ شروع ہوا۔ زرعی اجناس بتعداد کثیر ممالک غیر کو بھیجی جانے لگیں اور کاشتکار و صارف میں راست تعلق باقی نہیں رہا۔ یہ صورت حال ہندوستانی کاشتکار کے لئے نئی تھی۔ وہ ان بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا نہ کرسکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا کہ جو کاشتکاروں اور صارفین کے درمیان واسطہ کا کام کرنے لگا۔ ان درمیانی اشخاص کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوا۔ نہ صرف ان کی ضرورت سے زیادہ تعداد بلکہ ان کے کاروباری طریقے کاشتکاروں کے حق میں مضر ثابت ہونے لگے۔ دیہات میں فروخت پیداوار کے کاروبار عام طور پر ایک ایسے طبقے سے متعلق ہو گئے جو قرض کا لین دین کرتا ہے۔ چنانچہ ساہوکار کاشتکار کی اعتباری سہولتیں مہیا کرتا ہے اور اس کے کاروبار کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کاشتکار اپنی پیداوار اسی کے ہاتھ فروخت کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے نہایت ہی سستے داموں پر کاشتکار سے پیداوار خریدی جاتی ہے۔ یہ سب درمیانی اشخاص کاروبار میں خاصا منافع کماتے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قیمت جو صارفین ادا کرتے ہیں اور وہ قیمت جو کاشتکاروں کو

وصول ہوتی ہے اس میں کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ ہمارے کاشتکار کی غربت اور افلاس بڑی حد تک نتیجہ ہے فروخت پیداوار کے اس ناقص نظام کا جو ملک کے بدلتے ہوئے حالات سے کاشتکار کے مطابقت پیدا کرنے کا ہوا۔

درمیانی آدمی جو کاشتکار پر ہر حیثیت سے فوقیت رکھتے ہیں منڈیوں پر مسلط ہو گئے ہیں اور غریب کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ کا کوئی امکان نہیں رہا سال بھر کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اس کو نہ پیٹ بھر غذا میسر آتی ہے اور نہ تن ڈھا کنے کپڑا ملتا ہے۔ ہندوستانی کاشتکار غربت، افلاس، تباہ حالی، فکرو مصیبت کے لئے اپنی آپ مثال ہے۔ چونکہ ہندوستان میں زراعت صرف ایک پیشے کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک "طریقۂ زندگی" ہے لہذا ہندوستانی کاشتکار باوجود نقصان اٹھانے کے، یہ پیشہ ترک نہیں کرتے۔ کاشتکاروں کی ابتر حالت دراصل ملک کی زراعت کی پستی کا نہایت ہی اہم سبب بنی ہوئی ہے ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کی طرح حیدرآباد میں بھی فروخت پیداوار کا ایک غیر موزوں نظام کاشتکاروں کی غربت اور افلاس کا ایک بڑا سبب ہے۔ دیہات میں جو ساہوکار کاشتکاروں کو اعتباری سہولتیں مہیا کرتے ہیں وہی پیداوار کی فروخت کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ ساہوکاروں کے کاروباری طریقوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ موسم پر کاشتکاروں کو تخم فراہم کرتے ہیں اور پھر دوران کاشت ان کی رقمی ضرورتوں پر چھوٹے چھوٹے قرضے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں کے لئے بھی کاشتکار ساہوکار سے قرض حاصل کرتے ہیں۔ دیہات میں ایک موضع یا تعلقہ کے کاشتکار ایک ہی ساہوکار سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر ساہوکار کا بہت زیادہ اثر یا اقتدار ہوتا ہے۔ اور کاروبار کے طریقوں کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کاشتکار اپنی پیداوار ساہوکار کے ہاتھ فروخت کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ساہوکار اپنا قرض جنس کی شکل میں وصول کرتا ہے اور وہ جو قیمت ادا کرتا ہے وہ بازار کے نرخوں سے بہت کم ہوتی ہے۔ ساہوکار کی ناراضگی کے خوف سے بالعموم کاشتکار کہیں اور پیداوار فروخت نہیں کرتے اور جو قیمت بھی ساہوکار دیتا ہے اس پر قناعت کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے کاشتکاروں کی مالی حالت اس قدر ابتر ہے کہ اکثر مرتبہ فصل تیار ہونے سے قبل ہی وہ یا تو رہن کر دی جاتی ہے یا پھر وہ قبل از قبل فروخت ہو جاتی ہے۔

گو موجودہ جنگ کی وجہ قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے حالات میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور ہوئی ہے ۔ لیکن آغاز جنگ سے قبل بالخصوص گذشتہ کساد بازاری کے دوران میں ہمارے کاشتکار ساہوکار طبقے کے رحم و کرم پر تھے جو ان کا استحصال کرتا تھا ۔

## کاشتکاروں کی عدم تنظیم

کاشتکار طبقے کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں کوئی تنظیم نہیں ہے فصل کی تیاری لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاشتکار اپنی پیداوار علحدہ علحدہ طور پر فروخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کی وجہ رسد میں یکایک اضافہ ہو جاتا ہے اور قیمتیں گرنے لگتی ہیں کاشتکار چونکہ غیر منظم ہیں لہذا وہ قیمتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے اور جو قیمت بھی وصول ہو اس پر اکتفا کر لیتے ہیں اگر بعض کاشتکار اپنی پیداوار روک رکھنے کی بھی کوشش کریں تو بھی اس سے قیمتوں پر کوئی خاطر خواہ مفید اثر نہیں پڑھ سکتا ۔

## عجلت پسندی کے اسباب

فصل کی تیاری کے ساتھ ہی کاشتکار اپنی پیداوار جلد از جلد فروخت کر دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ جس کے چند اسباب ہیں ۔ (۱) اول تو یہ کہ انھیں فصل کی تیاری کے ساتھ ہی بعض رقمی مطالبات کی پابجائی کرنا پڑتا ہے جو ان کے ذمہ واجب الادا رہتے ہیں ۔ چنانچہ زر الگزاری اور ساہوکار کا قرضہ اور اس کا سود فصل کی تیاری کے ساتھ ہی ادا کرنا پڑتا ہے ۔ چونکہ کاشتکار کے پاس کوئی پس انداز نہیں ہوتا ۔ لہذا اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اپنی پیداوار جلد از جلد فروخت کر کے ان مطالبات کی ادائی کرے ۔

علاوہ بریں چونکہ ہمارے کاشتکاروں کے پاس پیداوار ذخیرہ کرنے کے کوئی انتظامات نہیں ہوتے، اور فصل کاٹنے کے بعد وہ کھیتوں میں پڑی رہتی ہے، جہاں بارش سے نقصان پہنچنے یا چرالئے جانے کا خطرہ رہتا ہے لہذا کاشتکار اسے جلد از جلد فروخت کر دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔

چونکہ سہولت بخش ذرائع نقل و حمل حاصل نہیں ہیں و نیز دیہات میں پختہ سڑکیں نہیں پائی جاتیں لہذا بارش کا موسم شروع ہونے سے قبل کاشتکار پیداوار فروخت کر دیتے ہیں ۔ کیونکہ بارش شروع ہونے پر بنڈیوں کے ذریعہ پیداوار کی نقل و حمل کچی سڑکوں پر نہایت وقت طلب ہو جاتی ہے ۔

## نقل و حمل کی دقتیں

فروخت پیداوار کے سلسلے میں ذرائع نقل وحمل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سہولت بخش ذرایع نقل وحمل حاصل نہ ہونے کی وجہ سے کاشتکاروں کو بڑی منڈیوں میں اپنی پیداوار فروخت کرنے میں گوناگوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حیدرآباد کے دیہاتوں میں سڑکوں کی حالت انتہائی غیر اطمینان بخش ہے۔ موسم بارش میں کیچڑ اور پانی کی کثرت سے سامان کی نقل وحمل بے حد دشوار ہو جاتی ہے۔ ریلوں کی سہولتیں زیادہ وسیع پیانے پر حاصل نہیں ہیں۔ موٹروں کا استعمال اس غرض کے لئے نہایت محدود ہے۔ لے دیکر زرعی اجناس کی نقل وحمل کے لئے بنڈیاں رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کا استعمال نہایت کثرت سے ہوتا ہے لیکن چونکہ بنڈیوں کے ذریعے دور دراز کی منڈیوں کو پیداوار بھیجنے میں مصارف زیادہ لاحق ہوتے ہیں لہذا کاشتکار مجبور رہیں کہ اپنی پیداوار مقامی طور پر فروخت کرلیں۔ جہاں انھیں دام اچھے نہیں ملتے۔

## آمیزش کا رجحان

عام طور پر دیہات میں "دڑا" کا طریق مروج ہے۔ یعنی اعلیٰ ادنی ہر قسم کی اجناس ایک ہی نرخ پر خرید کیجاتی ہیں اس کی وجہ عمدہ پیداوار لانے والا کاشتکار نقصان میں رہتا ہے۔ چونکہ کاشتکاروں کو پیداوار کے دام اچھے نہیں ملتے لہذا وہ اس میں کوڑا کرکٹ اور مٹی ملا کر وزن میں اضافے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس سے بالآخر اسی کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس سے صرف مصارفِ نقل وحمل میں بلا وجہ اضافہ ہوجاتا ہے بلکہ جب بڑے تاجر پیداوار خرید کرتے ہیں تو وہ قیمت کے تعین کے وقت پیداوار صاف کرانے کے اخراجات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بلاواسطہ کاشتکار کے معاوضے میں کمی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ حکومت ہند کی جانب سے مختلف زرعی اجناس کی فروخت کے متعلق جو تحقیقات ( ) ہوئیں، ان میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کی چاول اور گیہوں کی پیداوار میں کوڑا کرکٹ اور گھنے ہوئے دانوں کی مقدار کا تعین کیا گیا۔ حیدرآباد کے گیہوں کی حد تک کوڑا کرکٹ اور گھنے ہوئے دانوں کی مقدار ½۱۴ فیصد مقرر کی گئی۔ جو دوسرے تمام علاقوں کی پیداوار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ حالانکہ خود وسط ہند کے گیہوں میں کوڑا کرکٹ کی مقدار صرف ½۲ فیصد ہے۔ ان حالات

میں اس امر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے یہاں کے کاشتکاروں کو ان کی پیداوار کا کس قدر کم معاوضہ ملتا ہے۔

## اوزان اور پیمانوں کی عدم یکسانیت

ہندوستان کے دیگر علاقوں کی مانند حیدرآباد میں بھی اوزان اور پیمانوں میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ جگہ جگہ ایک ہی نام کے اوزان اور پیمانے مختلف مقداروں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور ان پیمانوں کی عدم یکسانیت فروخت پیداوار کے سلسلہ میں گوناگوں دقتوں کا باعث بنتی ہیں۔ پیمانوں کا استعمال قانوناً ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن دیہات میں یہ اب بھی کاروبار میں مستعمل ہیں۔ ان چھوٹے بڑے پیمانوں اور غلط اوزان سے نہ صرف کاشتکار کو دھوکا دیا جاتا ہے بلکہ بڑے بڑے تاجروں کو بھی پیداوار راست کاشتکاروں سے خریدنے میں تامل ہوتا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ درمیانی اشخاص نے فروغ حاصل کیا ہے۔ کیونکہ بڑے تاجران سے معاملہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جو معیاری اوزان سے کاروبار کرتے ہیں۔

## درمیانی اشخاص کی کثرت

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں تجارت کے طریقوں کے مدنظر درمیانی اشخاص کی ضرورت پیش آتی ہے اور ان کے وجود کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ ایک اہم خدمت انجام دیتے ہیں۔ لیکن ان کے موجودہ کاروباری طریقے اور ان کی ضرورت سے زیادہ تعداد ضرور قابل اعتراض ہے۔ یہ لوگ ممکنہ حد تک کم داموں پر کاشتکار سے پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں دیہات میں مقامی ایجنٹ پھیری والے وغیرہ کاشتکار سے براہ راست پیداوار خرید کرتے ہیں۔ ان سے تعلقہ یا ضلع کا ایجنٹ خرید کرتا ہے۔ اس کے بعد تھوک فروش تاجروں سے ہوتے ہوئے اجناس خردہ فروش تاجروں کے ذریعہ صارفین تک پہنچتی ہے۔ یا تھوک فروش تاجروں سے برآمد کنندوں کے ایجنٹ خرید کرتے ہیں غرض اس طرح درمیان میں متعدد اشخاص نفع کماتے ہیں اور کاشتکار اس زائد نفع سے محروم رہتے ہیں۔ اور چونکہ ان میں حالات پر قابو پانے کی اہلیت نہیں ہے اس لئے نقصان اٹھاتے ہیں۔

## غیر منظم بازار

کاشتکار کے نقصان اٹھانے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک میں منظم بازار زیادہ نہیں ہیں۔

وہ کاشتکار جو اپنی پیداوار آزادی کے ساتھ فروخت کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور جو اچھے دام حاصل کرنے کے لئے اپنی پیداوار ضلع یا تعلقہ کی منڈی کو لیجاتے ہیں وہ کچھ زیادہ فائدے میں نہیں رہتے۔ درمیانی اشخاص منڈیوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں اور منڈی کے بیوپاری جنھیں کم و بیش روزانہ ان لوگوں سے سابقہ رہتا ہے، کاشتکاروں کی حمایت میں انھیں ناراض کرنا نہیں چاہتے۔ یہاں کے اڑتھیا (کمیشن ایجنٹ) اور دلال وغیرہ اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہوسکے کاشتکار سے کمتر قیمتوں پر پیداوار خریدی جائے۔ ان منڈیوں میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہوتا کہ کاشتکاروں کے حقوق کا تحفظ ہوسکے۔

دلال اور اڑتھیا کاشتکار کے روبرو نرخ کا تعین کرتے ہیں۔ لیکن بعض وقت کاشتکار کے غیاب میں بھی نرخ طے پاتی ہے اور کاشتکار کو اس سے کمتر نرخ بتلائی جاتی ہے۔ اڑتھیا جو فروشندے کے حقوق کا محافظ سمجھا جاتا ہے، بجائے اس کے کہ کاشتکاروں کو زیادہ سے زیادہ قیمت دلائے وہ انھیں ان کے جائز معاوضے سے بھی محروم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

بہرحال نرخ طے پانے کے بعد پیداوار کو خریدار کی دوکان یا گرفی پر لیجایا جاتا ہے، جہاں پر اس کو تولنے کا انتظام ہوتا ہے۔ تولتے وقت پیداوار میں صدہا قسم کے نقائص نکالے جاتے ہیں اور بعض وقت نرخ کو مزید گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یا پھر کاشتکار کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ فی من یا فی پلہ کچھ زیادہ پیداوار بلاقیمت دے جس کو "کردا" کہتے ہیں۔ اگر ایسی صورت پیدا ہوجائے تو پھر کاشتکار کے لئے دو ہی راہِ عمل ہوتی ہیں یا تو وہ اپنی پیداوار واپس لے جائے یا پھر کردا دینے پر تیار ہوجائے۔ دیہات کے کاشتکار منڈی کے ان حالات میں کچھ پریشان سے ہوجاتے ہیں اور بجائے پیداوار واپس لیجانے کے نرخ میں کچھ کمی کرنے یا کردا دینے پر رضامند ہوجاتے ہیں۔

اب جہاں تک تول کا تعلق ہے، تول کی مقدار چھوٹی ہوتی ہے۔ اوزان بالعموم صحیح ہوتے ہیں لیکن تولنے کا ڈھنگ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ پیداوار زیادہ تلتی ہے۔ اس کے علاوہ تولنے کی اجرت جنس کی شکل میں ہاتھوں سے وصول کی جاتی ہے۔ غرض اس طرح کاشتکار کو دل کھول کر لوٹا جاتا ہے۔

جب کاشتکار کو اس کی پیداوار کی قیمت ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو اس سے طرح طرح کے

معاوضے وصول کئے جاتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے کاشتکار کو وصول شدنی قیمت میں مزید ۷ تا ۱۰ فیصد کی کمی ہوجاتی ہے۔ اڑتھیا اپنا کمیشن بالعموم قیمتی پیداوار کے لئے فی صد کے حساب سے اور سستی قسم کی اجناس کے لئے پیداوار کے وزن کے لحاظ سے وصول کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ دونوں صورتوں میں اپنا فائدہ پیش نظر رکھتا ہے۔ کمیشن کی شرح بھی زیادہ ہوتی ہے اس کے علاوہ وہ کاشتکار سے مختلف قسم کے معاوضے محاصل اور چندے وصول کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ "حمالی" (خواہ حمالوں کی ضرورت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو) معمول (یہ پتہ نہیں کہ یہ کس مد میں وصول کیا جاتا ہے)۔ خاکروب کا معاوضہ، گاؤشالہ یا دھرم شالہ کا چندہ (خواہ کاشتکار کسی مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھے اور نیز وہ اس کے ادا کرنے پر رضامند ہو یا نہ ہو) یہ تمام کاشتکار کی اداشدنی قیمت میں سے وضع کر لئے جاتے ہیں۔ ان کی مقدار ۷ فیصد سے لے کر ۱۰ فیصد تک ہوتی ہے۔ غرض منڈیوں کے ان حالات میں کاشتکار کو اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا اتنا حصہ ملتا ہے جو اس حقیقی معاوضے سے بہت ہی کم ہوتا ہے۔

## حکومت کی اصلاحی تدبیریں

فروخت پیداوار سے متعلقہ امور کا مختصراً حال معلوم کرنے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ حکومت نے اس سلسلے میں کیا اصلاحی تدبیریں اختیار کی ہیں اس میں شک نہیں کہ ابتداءً حکومت نے پیداوار بڑھانے اور عمدہ اقسام کی ترویج کی جانب توجہ کی لیکن فروخت پیداوار کے سلسلے میں اصلاحیں عمل میں لانے کی جانب توجہ نہیں ہوئی۔ تاہم بہت جلد اس مسئلہ کی اہمیت کو بھی محسوس کیا گیا۔ حیدرآباد میں ۱۳۳۹ف میں "قانون زرعی مارکٹ" نافذ ہوا۔ اس کے ذریعہ ریاست کی منڈیوں اور بازاروں کو منظم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاہی زرعی کمیشن نے فروخت پیداوار سے متعلق اپنی سفارشوں میں یہ بتایا کہ حیدرآباد کے قانون کے طرح دیگر صوبوں میں بھی قوانین نافذ کئے جائیں تاکہ فروخت پیداوار کے طریقوں کی اصلاح ہوسکے۔

حیدرآباد میں چیف مارکٹنگ افسر کے تحت مارکٹنگ کا محکمہ قائم ہوا ہے اس نے قانون زرعی مارکٹ بابتہ ۱۳۳۹ف کے تحت ممالک محروسہ سرکار عالی کے بازاروں اور منڈیوں کو منظم بنانے کی جانب توجہ کی

علاوہ بریں مختلف زرعی اجناس کی فروخت سے متعلقہ امور، بازار اور منڈیوں کی کیفیت وغیرہ کی نسبت تحقیقی کام شروع کیا ہے۔

**منظم بازار** محکمۂ مارکٹنگ کی کوشش ہے کہ ملک کی تمام منڈیوں اور بازاروں کو منظم بنایا جائے۔ گو یہ ایک نہایت دشوار مسئلہ ہے تاہم اس محکمہ کی جد و جہد کے نتیجے کے طور پر اس وقت تک ۲۳ بازاروں کو منظم بنایا گیا ہے۔

منظم بازار کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں جو کاروبار انجام پاتے ہیں وہ مقررہ اصولوں اور قواعد و ضوابط کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہر منظم بازار میں ایک "مارکٹ کمیٹی" ہوتی ہے۔ قانون کے مطابق اس کے اراکین ۸ سے ۱۶ تک ہو سکتے ہیں۔ لیکن بالعموم یہ بارہ ۱۲ ارکان پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جس میں سے چھ کاشتکاروں کے نمایندے، چار تاجروں کے نمایندے، ایک سرکاری اور ایک بلدیہ یا لوکل بورڈ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ کاشتکاروں کے نمایندے اول تعلقدار ضلع کے نامزدہ ہوتے ہیں۔

مارکٹ کمیٹی بازار کا انتظام اور صفائی وغیرہ سے متعلقہ امور انجام دیتی ہے۔ منظم بازاروں میں کاروبار کرنے کے لئے آڑتھیوں، دلالوں، وزن کشوں وغیرہ کے لئے مارکٹ کمیٹی کی جانب سے اجازت نامے جاری کئے جاتے ہیں۔ غیر اشخاص کو مارکٹ میں کاروبار کرنے کا حق نہیں ہوتا اور مارکٹ کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر اجازت نامہ منسوخ کر دیا جاتا ہے مارکٹ کمیٹی بازار کے اوزان اور پیمانوں پر نگرانی رکھتی ہے اور وقتاً فوقتاً ان کی تنقیح کا انتظام کرتی ہے اس کے علاوہ مارکٹ کے لئے عمارتوں کے نقشے اور ان کی برآورد کی ترتیب و منظوری مارکٹ کمیٹی ہی طے کرتی ہے۔ اجازت ناموں کی اجرائی و نیز فروخت کے لئے لائے ہوئے مال پر محصول وصول کرنے سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ مارکٹ کمیٹی کے فنڈ میں جمع ہوتی ہے۔ اس فنڈ کو مارکٹ کے قیام و ترقی، مارکٹ کے اغراض کے لئے ضروری مکانوں کی تعمیر و ترمیم و نیز مارکٹ کے مامورہ عہدہ داروں اور ملازمین کی تنخواہوں اور وظائف وغیرہ کے سلسلے میں صرف کیا جاتا ہے۔

منظم بازار میں پیداوار کی فروخت نیلام کے ذریعہ انجام پاتی ہے اس طریقے کے تحت

خریداروں میں آپس کے مقابلے کی وجہ کاشتکار کو اچھے دام ملنے کی توقع ہوتی ہے بیوپاریوں کے لئے رسیدوں کا جاری کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور رسیدیں مقررہ نمونے کے مطابق ہوتی ہیں اوزان کو معیاری بنانے کے لئے تمام منظم بازاروں میں ۸۰ سیر کا من اور ۳ من کے پلے کی مناسبت سے قیمتوں کا تعین عمل میں آتا ہے۔ مارکٹنگ کا محکمہ ان منظم بازاروں سے قریبی تعلق رکھتا ہے اور ہر قسم کی بدعنوانیوں کے انسداد کے لئے ضروری کاروائیاں کرتا ہے۔

گو منظم بازاروں کی تعداد نہایت محدود ہے لیکن جہاں کہیں ایسے بازار قائم ہیں وہاں اطراف واکناف کے علاقوں کے کاشتکاروں کو ان کی پیداوار کے اچھے دام ملتے ہیں لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے بازار زیادہ تعداد میں قائم کئے جائیں۔

**روئی کی فروخت** روئی حیدرآباد کی ایک اہم تجارتی فصل ہے۔ گذشتہ چند سال سے محکمہ زراعت کی کوششوں سے گورانی کپاس نمبر (۶) کی ایک ترقی یافتہ قسم کی کاشت کو ضلع ناندیڑ میں خاص وسعت و ترقی دی گئی۔ یہ روئی نہ صرف اپنی نفاست اور عمدگی کے لحاظ سے خاصی مقبول ہوئی ہے بلکہ کاشتکار اس کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ فی ایکڑ کپاس کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ اس روئی کی فروخت کا انتظام بذریعہ نیلام کیا گیا جس میں شائقین نے دلچسپی لی اور کاشتکاروں کو اچھی قیمتیں وصول ہوئیں۔ اس کے علاوہ "صدر جمعیت امداد باہمی کپاس" کا ناندیڑ میں قیام عمل میں آیا جس کا مقصد یہ ہے کہ امداد باہمی کے اصولوں کے مطابق روئی کی فروخت کا طریقہ ترقی کرے

**پیمانوں کی مسدودی** یکم شہریور ۱۳۵۳ف کو تمام ممالک محروسہ سرکار عالی میں خرید و فروخت کے سلسلہ میں پیمانوں کے استعمال کو ممنوع قرار دیا گیا۔ دیہات میں صدہا اقسام اور مختلف گنجایشوں کے پیمانے مروج تھے اور کاشتکاروں کو بہت زیادہ فریب دیا جا سکتا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب پیمانوں کا استعمال بالکل ختم ہو گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کا استعمال قابل لحاظ حد تک گھٹ گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے فروخت کے طریقوں کی اصلاح میں بڑی مدد ملی ہے۔

**غلہ کے گودام** تنظیم دیہی کے سلسلے میں حیدرآباد میں جو کام ہوا ہے، اس میں قابل ذکر یہ ہے کہ فروخت پیداوار

کے طریقوں سے اصلاح کرنے کی جانب بہت کچھ توجہ کی گئی ہے۔ غلہ رکھنے کے لئے گودام بنائے گئے ہیں۔ چنانچہ اب تک کم و بیش . . اگودام مختلف مقامات پر قائم ہیں۔ عام طور پر کاشتکاروں نے چاول، جوار اس میں محفوظ رکھا ہے لیکن اس سلسلے میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ مختلف کاشتکار جو پیداوار لاتے ہیں، اس میں قسم قسم کے لحاظ سے بہت فرق پایا جاتا ہے گھٹیا اور بڑھیا ہر قسم کی پیداوار لائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اچھی پیداوار لانے والا کبھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اس کی پیداوار گھٹیا اقسام میں ملادی جائے۔ لہذا عام طور پر عمدہ پیداوار لگانے والے ان گوداموں میں اپنی پیداوار محفوظ کرانے سے احتراز کرتے ہیں۔

حکومت نے فروخت پیداوار کے طریقوں میں اصلاح کرنے کی جانب بہت کچھ توجہ کی ہے۔ چنانچہ زراعت، امداد باہمی، اور تنظیم دیہی کے محکموں نے اس مسئلہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور بہت سی اصلاحی تدبیریں اختیار کی ہیں آیندہ کے لئے نہ صرف زرعی اجناس بلکہ مویشی، دودھ، انڈے اور میووں کی فروخت سے متعلقہ مسائل کا حل بھی حکومت کے پیش نظر ہے۔

## مزید توجہ کی ضرورت

فروخت پیداوار کے مسئلے کی اہمیت کے مدنظر حکومت نے اس جانب جو توجہ کی اور جو مفید اصلاحیں کی ہیں وہ یقیناً قابل ستائش ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حکومت کا دائرہ عمل نہایت محدود ہے اور مسئلے کی اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ اس جانب بیش از بیش توجہ کی جائے۔

فروخت پیداوار کا ایک عمدہ اور ترقی یافتہ نظام ملک میں قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حکومت کے سامنے ایک واضح اور ہمہ گیر لائحہ عمل ہو محکمہ جات مارکٹنگ، امداد باہمی، تنظیم دیہی، زراعت وغیرہ میں اس مقصد کے حصول کے لئے نہایت قریبی تعلق اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ کیونکہ بغیر اجتماعی اور متحدہ جد و جہد اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی ممکن نہیں ہے۔

### فروخت پیداوار کیلئے انجمنیں

فروخت پیداوار کے سلسلے میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں، ان کے انسداد کے لئے یہ ضروری ہے کہ درمیانی اشخاص کی ضرورت سے زیادہ تعداد کو گھٹا دیا جائے، اور کاشتکار اور صارف میں ممکنہ حد تک قریبی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اور اس مقصد کے حصول کے لئے امداد باہمی کے اصولوں پر فروخت پیداوار کی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جائے ہر موضع یا تعلقے کے کاشتکاروں کی ایک انجمن ہو اور یہ اپنے اراکین کی پیداوار فروخت کرنے کا انتظام کریں۔ یہ انجمنیں براہ راست شہروں کے ٹھوک فروش تاجروں اور برآمد کنندوں سے ربط قائم کریں اس سے انھیں پیداوار کی قیمتیں اچھی وصول ہوں گی اور وہ کثیر منافع جو بیبیوں درمیانی اشخاص کماتے ہیں وہ کاشتکاروں ہی کو حاصل ہوگا۔ اگر شہر حیدرآباد اور ضلع کے منتفروں وغیرہ بر صارفین کی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جائے اور ان کا تعلق راست کاشتکاروں کی فروخت پیداوار کی انجمنوں سے ہو تو پھر کاشتکار اور صارفین دونوں فائدے میں رہ سکتے ہیں۔ موجودہ جنگ سے پیدا شدہ حالات میں حکومت کو اجناس کی رسد حاصل کرنے میں جو مشکلات پیش آرہی ہیں ان کا سدباب ہو جاسکتا ہے اگر ملک میں وسیع پیمانے پر فروخت پیداوار کی انجمنیں قائم ہوں تو ان کے ذریعہ راست پیداوار فروخت ہوسکے گی اور درمیانی آدمیوں کی نفع اندوزی کی غرض سے اجناس کی ذخیرہ بازی کے رجحان کا انسداد بھی ہو جاسکے گا۔

لہذا کم از کم موجودہ حالات کی ضروریات کی بناء پر جلد از جلد ایسے انجمنوں کے وسیع پیمانے پر قایم کرنے کی جانب محکمہ امداد باہمی کو اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ کاشتکاروں کو ایسی انجمنیں قائم کرنے کی نہ صرف ترغیب دی جائے بلکہ ان کے قیام میں ہر ممکنہ سہولتیں باہم پہنچائی جائیں۔

فروخت پیداوار کی انجمنوں کے پاس پیداوار ذخیرہ کرنے کے لئے گودام ہونے چاہئیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی مالی حالت اس قدر استوار ہونی چاہیئے کہ یہ اراکین کو ان کی پیداوار کی کفالت پر فوری رقمی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے قرض دے سکیں لہذا امداد باہمی کے سنٹرل بنکوں کی جانب سے ایسی انجمنوں کی مالی امداد کا انتظام ہونا چاہیئے علاوہ بریں ان انجمنوں کو ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جانی چاہئے کہ ان کے کاروبار میں ترقی ہو اور دوسرے کاشتکاروں کو ان میں شریک ہونے کی ترغیب دی جاسکے۔ ایسے گاؤں دیہات جو ریلوے اسٹیشنوں سے قریب ہوں وہاں پر دودھ کی صنعت ( ) کو ترقی دی جائے اور انجمنوں کے توسط سے ان کی پیداوار فروخت کے لئے روزانہ شہروں کو پہنچانے کا انتظام ہو تو پھر اس سے نہ صرف دیہاتیوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا بلکہ شہروں کے لئے دودھ، مکھن وغیرہ کے جیسے ضروری اشیا کی رسد میں بھی خاطر خواہ

اضافہ ہوگا ہمارے دیہاتوں میں دودھ کی صنعت، مرغبانی، باغبانی وغیرہ کی ترقی کے پورے مواقع موجود ہیں اگر فروخت کے بہتر انتظامات کے ذریعہ پیداوار کی نکاسی کا انتظام کیا جاسکے۔

## آمیزش کے رجحان کو روکنے کی ضرورت

کاشتکاروں کا یہ رجحان کہ عمدہ اقسام میں ناقص اقسام کی آمیزش کرتے ہیں وہ نیز کوڑا کرکٹ اور مٹی ملاکر وزن بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں مناسب نہیں ہے اس سے تو ان کو نقصان پہنچتا ہے اول سے حیدرآباد کی کوئی پیداوار ایسی نہیں جس کے متعلق یہ کہا جاسکے وہ قسم کے لحاظ سے اعلیٰ ترین ہے اور اب اس کو ناقص اقسام اور مٹی کی آمیزش سے مزید خراب کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بیرونِ ملک یہ پیداوار اچھی نظروں سے نہیں دیکھی جاتی اور اس کی نکاسی میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ روئی کی حد تک ناقص اقسام کی آمیزش کو روکنے کے لئے برطانوی ہند کے نمونے پر یہاں پر بھی قانون سازی ہوئی ہے اور اس کی وجہ امیزش کے روک تھام میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قسم کی تدبیریں دوسری اجناس کے لئے بھی اختیار کی جائیں چاول، گیہوں، جوار، باجرا اور دیگر اجناس خوردنی کو صاف اور عمدہ حالت میں فروخت کرنے کے انتظامات کئے جائیں تاکہ یہاں کی پیداوار کی شہرت ہو اور قیمتیں اچھی ملیں۔

## درجہ بندی

پیداوار نہ صرف صاف اور عمدہ حالت میں ہو بلکہ باقاعدہ درجہ بندی ( ) کے ساتھ اس کی فروخت کا انتظام ہونا چاہئے۔ برطانوی ہند میں " " نشان کے تحت چاول، گھی، انڈے، مربے وغیرہ کی درجہ بندی کے تیز جو فروخت کا انتظام ہوا اس سے قیمتیں زیادہ وصول ہوئیں اور فروخت میں بھی اضافہ ہوا۔ لہذا حیدرآباد میں بھی اس جانب توجہ کی ضرورت ہے۔

## تحقیقات

آغاز جنگ سے قبل یہاں کے محکمۂ مارکٹنگ نے مختلف اجناس کی فروخت کے متعلق تحقیقی کام ( ) انجام دیا تھا۔ اور کل ہند اساس پر رودادوں کی اشاعت کے لئے یہ مواد حکومتِ ہند کو بہم پہنچایا گیا۔ جنگ کی وجہ سے حالات میں ایک انتشار پیدا ہوگیا ہے۔ لہذا جنگ کے بعد اس جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور انفرادی طور پر حیدرآباد کے نقطۂ نظر سے بھی اس قسم کی رودادیں شائع کئے جانے کا انتظام ہونا ضروری ہے۔

**لاسلکی** آل انڈیا ریڈیو کی مانند حیدرآباد کے ریڈیو سے بھی دیہاتی نظاموں کی نشر کا انتظام ہونا چاہئے۔ مقامی زبانوں میں دلچسپ نظام ناموں کی نشر کے ذریعہ کاشتکاروں کو فروخت کے طریقوں اور اجناس کے تازہ ترین نرخوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔

**مسئلے کی اہمیت** موجودہ جنگ سے ملک کے زرعی نظام پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان سے اس نظام کی خامیاں منظر عام پر آگئی ہیں۔ اور یہی وہ نقائص تھے جن کی وجہ سے معاشرے کو سخت مصائب سے دو چار ہونا پڑا۔

ایک طرف زرعی اجناس کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے سے ملک کے کم مستطیع طبقے متاثر ہوئے تو دوسری طرف کاشتکاروں کو بھی زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن درمیانی آدمیوں نے خوب منافع کمایا حقیقت میں یہ نتیجہ ہے فروخت پیداوار کے مروجہ نظام کی خرابیوں کا۔ بہرحال موجودہ حالات ہمارے لئے سبق آموز ہیں۔ اور ان تجربوں کی بنا پر جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد فروخت پیداوار کے طریقوں میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

جنگ کے بعد جب معاشرہ کی تعمیر جدید کی جانب توجہ کی جائے گی تو اس وقت مزارعین کی آمدنی بڑھانا اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنا حکومت کا مطمح نظر ہونا چاہیے ایک نہایت افسوسناک حقیقت ہے کہ کاشتکار جو معاشرے کی عظیم تر خدمت انجام دیتا ہے افسوسناک حالت میں ہے وہ غربت اور مصائب و آلام کا پیکر مجسم بنا ہوا ہے۔ نہ پیٹ بھر روٹی ملتی ہے نہ تن ڈھانکنے کپڑا میسر آتا ہے۔ گھاس پھوس کی تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں یہ اپنی زندگی کے دن پورے کرتا ہے لہذا جنگ کے بعد تعمیر نو کے نظام نامے کے تحت حکومت کا یہ اہم ترین فریضہ ہوگا کہ وہ دیہی آبادی کے معیار زندگی بڑھانے اور دیہاتیوں کو خوشحال بنانے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھے اور یہ مقصد ایک معقول اور ترقی یافتہ فروخت پیداوار کے نظام کے قیام سے بڑی حد تک حاصل ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ حکومت کے سامنے ایک واضح اور غور کردہ منصوبہ ہو۔

شفیق الرحمن بی۔ اے (آخری)

# ڈیکارٹ

ہر عہد کا فلسفہ اس عہد کے خیالات اور احساسات کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے ڈیکارٹ کے خیالات کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے حالات سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرلیجائے۔

ظاہر ہے کہ یورپ اور ہند متوسطہ میں کلیسا کے آہنی پنجوں کا شکار ہوکر رہ گیا تھا زندگی اور زندگی کی ساری مصروفیتیں اسی کلیسا سے وابستہ ہوگئی تھیں کلیسا مذہبی فرائض کے علاوہ مدرسے کے کاروبار بھی خود ہی انجام دینے لگا تھا اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک طرف نجات کا ذریعہ ہے اور دوسری طرف تعلیم دنیوی کا حامل۔ تعلیم کا نظریہ تو اس طرح سے ختم ہوگیا کہ یونانیوں اور ہسپانیہ کے عربوں کی تعلیمات نے عوام کی آنکھیں کھول دیں۔ اب رہا یہ ادعا کہ "کلیسا نجات کا ذریعہ ہے" وہ "معافی گناہ" کے طریقے کی وجہ سے عجیب وغریب ہوکر رہ گیا۔ معافی گناہ کی شرمناک تجارت کو کیتھولک کلیسے نے جائز قرار دے رکھا تھا جواز کا فتویٰ اس طرح صادر کیا گیا تھا کہ چونکہ کلیسا بحیثیت ایک خدا کے نمائندے کی سی ہے اس لئے اس کا یہ حکم ارادۂ الٰہی کے موافق ہے اگر وہ گناہوں کو معاف کرنے کے وعدے سے روپیہ طلب کرے تو ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اس کی تعمیل کرے ہوسکتا ہے کہ اس طریقے سے کسی کے اخلاقی احساس کو صدمہ پہنچے لیکن کلیسا کے خدا سے حاصل کردہ حکم کے سامنے انفرادی احساس کی وقعت ہی کیا ہوسکتی ہے۔ فکر الٰہی فکر انسانی سے مختلف ہے"

"خدا کی حماقت میں بھی ہم سے زیادہ دانائی پائی جاتی ہے"

لیوتھر نے اس خیال کے خلاف علم احتجاج بلند کیا اور صاف طور پر بتلایا کہ معافی گناہ کا طریقہ بدنفس اہل کلیسا کی خیالی پیداوار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیوتھر کی تعلیمات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس خیال کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں کہ نجات الفاظ سے نہیں ایمان سے حاصل ہوسکتی ہے۔

لیکن ان جڑوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑا گیا حتی الامکان یہ کوشش کی گئی کہ نئے خیالات اور نئے

نظریات کسی طرح پھلنے پھولنے نہ پائیں ...... کلیسا کے لئے یہ انکشافات زہر کا کام دے رہے تھے کیونکہ کیتھولک کائینات اب بحیرۂ روم کی وادی، ایشیاء کے جنوب میں مغربی حصے اور شمالی یورپ کی حد تک ہی محدود نہ رہی بلکہ ایک طرف تو کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی اور دوسری طرف واسکوڈی گاما نے راس امید کا چکر کاٹ کر ہندوستان کا راستہ معلوم کرلیا اس سے فائدہ یہ ہوا کہ دنیا اس خیال سے واقف ہوئی کہ دنیا ایک کرہ ہے، فضا میں معلق ہے اور یہی حال سیاروں کا ہے کہ وہ کسی دوسری چیز میں چسپاں نہیں ہیں۔ نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ارسطو کے برج خواب کی باتیں ہو کر رہ گئے۔

کوپرنیکس نے زمین کو سیارات میں جگہ دی اور سورج کو مرکز زمین کی دوگانہ حرکت کا نظریہ پیش کیا خودساختہ دوربین سے چاند کو دیکھا اور ان کی گردش کا قانون دریافت کیا ان دونوں کو خیالات بدلنے کے لیے مجبور کیا گیا رونگٹے کھڑے کر دینے والی سزا دی گئیں اور بعضوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

اہل کلیسا حیران و پریشان ہو گئے کہ خیالات و تحقیقات کا یہ سیلاب کہیں ان کی ساری تعلیمات کو بہا نہ لیجائے کیونکہ اس طرح سے اگر یہ مان لیا جائے کہ زمین سیارہ ہے اور وہ آسمان میں حرکت کرتی ہے تو زمین و آسمان کا فرق غائب ہو جاتا ہے اور وہ دونوں ایک ناقابل تفہیم کائینات ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ۔

"ارسطو کے خلاف دنیا کو لامحدود ماننا کائینات سے علحدہ آسمان کے وجود کا انکار کرنا ہے اور فوق الفطرت نظام اشیاء اور عرش نشیں خدا کا منکر ہونا ہے۔"

غرض یہ کہ کوپرنیکس کا نظریہ ایک عظیم ترین اہمیت کا حامل ہے اور یورپ کی ذہنی تاریخ میں اسی سے ایک بڑے دور کا آغاز ہوتا ہے عالم غیب نفی محض نہیں بلکہ لامتناہی ہو جاتا ہے اور ورائیت کا تصور داخلیت الہٰی کے جدید اصول کی شکل اختیار کرتا ہے ہیگل نے بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہوئے دنیائے جدید کی فکر کی بنیاد اسی داخلیت ہی پر رکھی خود اسی کے الفاظ میں۔

"نوع انسان کو یہ معلوم ہوا کہ خدائے قدرت سورج چاند ستارے پودے گویا ابھی پیدا کئے ہیں اور نوایا

ابھی ابھی نافذ ہوئے ہیں جب انھوں نے عقل کل کو اپنی ہی عقل کا آئینہ پایا تو پہلی دفعہ ان کو اشیاء سے دلچسپی پیدا ہوئی، قوانین قدرت کے نام سے زمانے کے توہم عظیم اور ان خوفناک قوتوں کے متعلق خیالات کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا جن کی نسبت یہ خیال تھا کہ سوائے جادو کی مدد کے وہ مغلوب نہیں ہوسکتیں"۔

اسی ذہنی تصور کی پیداوار اطالیہ میں برونو انگلستان میں بیکن اور فرانس میں ڈیکارٹ ہے۔

رینے ڈیکارٹ ٹورین کے مقام (لاہے) میں مارچ ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا۔ لافلیج میں اس نے فلکیات و ریاضیات کی تعلیم حاصل کی اور مختلف موقعوں پر اپنی ذہانت کا ثبوت دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ بیوریا وغیرہ میں فوجی خدمات انجام دینے کے بعد ہالینڈ پہنچا تو ایک ریاضیاتی مسئلہ کو پوسٹر کی شکل میں دیوار پر چسپاں دیکھا اور زبان سے ناواقفیت کی بنا پر پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پڑھنے کے لئے کہا اتفاق سے یہ ڈارٹ یونیورسٹی کا پرنسپل' پروفیسر "بیک مین" تھا۔ پروفیسر موصوف اجنبی کے اس سوال پر ہنس دیتا ہے لیکن جب وہ دوسرے دن اس نوجوان فوجی کو اس مسئلہ کا حل پیش کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو حیرت سے اپنے دانتوں میں انگلی دے لیتا ہے۔ ۱۶۲۱ء میں وہ جرمنی کا ارادہ کرتا ہے اور اسی زمانے میں اسے ایک عجیب حادثے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ڈیکارٹ کشتی میں ایک دفعہ بیٹھا چلا جا رہا تھا کہ بعض ملاحوں نے اسے اجنبی اور مالدار خیال کر کے مار ڈالنا چاہا وہ اس کو اپنی زبان سے ناواقف سمجھ کر باتیں کر رہے تھے جیسے ہی اسے ان کے ارادے کا علم ہوتا ہے تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ان کی زبان ہی میں انھیں للکار کر خبردار کرتا ہے اس کی یہی عجلت جرأت اور دلیری اس کے فلسفے میں آشکارا ہے ۱۶۲۹ء میں اپنا استعفیٰ پیش کرنے کے بعد شادی بیاہ کے خیال کے بغیر صرف ایک لڑکی کو اپنی منہ بولی بیٹی بنا کر ڈیکارٹ' فلسفہ جدید کا بانی اپنی ساری عمر درس و تدریس کے لئے وقف کر دیتا ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ڈیکارٹ کو تمام علوم میں سب سے زیادہ دلچسپی ریاضیات ہی سے تھی بقول دیبر کے "وہ ایک ہندسی تھا جو مابعد الطبیعیات کا مذاق بھی رکھتا تھا نہ یہ کہ وہ

ایک فلسفی تھا جسے ہندسہ اور جبر و مقابلہ کا بھی شوق تھا" اپنی مشہور کتاب "بحث نہیج میں" ڈیکارٹ رقم طراز ہے کہ

"مجھے سب سے زیادہ لطف ریاضیات ہی سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس کے براہین قطعی اور بدیہی ہوتے ہیں لیکن مجھے ابھی تک ریاضیات کا صحیح استعمال معلوم نہ ہوا تھا اگرچہ میں اس بات سے واقف تھا کہ ریاضی صرف میکانکی فنون میں کام آتی ہے مگر مجھے تعجب تھا کہ اس قدر مضبوط اور مستحکم بنیاد پر کیوں اس سے اعلیٰ درجہ کی تعمیر کھڑی نہ کی گئی۔ اہل ہندسہ نہایت اہم براہین میں استدلال کے نہایت طویل مگر سادہ اور آسان سلسلوں سے کام لیتے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے خیال پیدا ہوا کہ نفس انسانی کی تمام باتیں اسی قسم کے سلسلوں میں منسلک ہو سکتی ہیں ان میں صرف اتنی بات کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ کسی شئے کو یونہی صحیح فرض نہ کر لیا جائے اور ایک صداقت کو دوسری صداقت سے نہایت ترتیب سے استنباط کیا جائے اس طرح انسان نہایت دور کے حقائق تک پہنچ سکتا ہے۔"

اس کے پڑھنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ڈیکارٹ فلسفہ کو نہ صرف ریاضیات کے بازو لاکر کھڑا کر دینا چاہتا ہے بلکہ اس کا مقصود ان دونوں کو ایک کر دینا ہے اس کے لئے سب سے پہلے اصول اولیہ کی ضرورت تھی یہ اصول نہ تو اس سے علیحدہ اس دنیا میں ملنے والے تھے اور نہ کسی ماورائی دنیا میں — اس کی نظر آفاق سے ہٹ کر انفس پر پڑ چکی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ تلاش صرف مشاہدہ باطن ہی کے ذریعہ نتیجہ تک پہنچ سکتی تھی چنانچہ اس میں اس کو ایک حد تک کامیابی ہوئی اور وہ نفسیاتی طریق کا موجد کہلایا۔

ڈیکارٹ کی نظر نے سب سے پہلے اپنے علم کا جائزہ لیا اور معلوم کیا کہ علم یا تو روایات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے یا حواس سے ...... روایات کا تو وہ قطعاً قائل نہیں اب رہا حواس کا معاملہ ..... اس کی حقیقت یہ ہے کہ کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا اگر آنکھوں کے سامنے لایا جائے تو وہ چاند اور سورج کو بھی ڈھانک لیتا ہے جو کہ خود زمین سے کئی گناہ بڑے ہیں۔ پانی جس پر انسانی زندگی کا بڑی حد تک مدار ہے وہ جیسے دن رات بیسیوں دفعہ پیا جاتا ہے خود اسے حواس ریگستان میں بڑی

شکل سے پہچان سکتے ہیں۔ مشعل کو زور سے گھماؤ تو دائرہ بن جاتا ہے غرض یہ کہ ہزاروں واقعات آئے دن ایسے پیش آتے ہیں کہ حواس کی صداقت پر سے یقین اٹھ جاتا ہے اور شک ہی شک نظر آنے لگتا ہے لیکن شک کی مایوس کن وادی میں تھک کر بیٹھ جانا ڈیکارٹ کا کام نہ تھا۔ اسے اصول اولیہ کی ضرورت تھی اور وہ انہیں یہیں سے فراہم کرکے اپنے فلسفے کی بنیاد قائم کرتا ہے۔

ڈیکارٹ ازحد دلنشین پیرائے میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ مجھے حواس کے ذریعہ صحیح علم حاصل نہیں ہوتا اور میں شک کرتا ہوں اس کے یہ معنی ہوئے کہ کم از کم دنیا میں یہ ایک بات یقینی ہوئی کہ میں شک کرتا ہوں مگر شک کرنا فکر کرنا ہے اور فکر کرنا بغیر موجود ہونے کے کیسے ہوسکتا ہے لہذا یہ بات یقینی ہے کہ میں موجود ہوں۔ I think therefore I am اس طرح سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ میں موجود ہوں نہایت آگے بڑھنے اور دائرۂ علم کو وسیع کرنے سے پہلے نہایت احتیاط سے کام لینا ضروری ہے کیونکہ کسی امر کے یقینی ہونے کے لئے بدیہی ہونا لازمی ہے "یہاں پر شک کرنے سے یہ تو لازم آیا کہ میں موجود ہوں لیکن یہ بات تو لازم نہیں آئی کہ میرا معروضِ خیال مجھ سے علحدہ عالم خارجی میں موجود ہے ہوسکتا ہے کہ میرے خیالات میرے اپنے تصور کی آپ پیداوار ہوں اور مجھے دھوکہ دے رہے ہوں۔ ڈیکارٹ کی مشکل آسان نہ ہوتی اگر اسے ان تصورات میں ایک ایسا تصور نہ مل جاتا جیسے کہ لامحدود کامل ہستی کا تصور یا خدا کہتے ہیں۔

خدا کا تصور انسان کا پیدا کردہ نہیں ہے کیونکہ محدود علت سے لامحدود معلول پیدا نہیں ہوسکتا اور اور جب یہ انسان کا پیدا کردہ نہیں ہے تو لازمی ہے کہ خدا کے تصور کا خالق خود خدا ہی ہو۔ علاوہ ازیں خدا کامل ہے اور کمال کے لیے وجود لازمی ہے اگر وجود ہی کو نکال لیا جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خدا پر یقین کرنے سے اس بات پر بھی یقین ہوجاتا ہے کہ خارجی دنیا بھی موجود ہے کیونکہ خارجی دنیا پر پیدائشی یقین ہے یہ یقین خدا کی طرف سے حاصل ہوتا ہے جو کہ مجھ کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔

اس طرح ہم تین حقیقتوں تک پہنچتے ہیں خدا، نفس اور عالم خارجی۔

ڈیکارٹ کا خدا کامل اور لامحدود جوہر ہے جس پر کہ تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے مگر خود

اس کا وجود کسی پر منحصر نہیں (لم یلد ولم یولد) روح فکر کرنے والا جوہر ہے جسم جوہر ممتد۔ ان تینوں جوہروں میں فرق معلوم کرنے سے پہلے یہ بتلانا ضروری ہے کہ جوہر سے مراد ایک ایسی شئے ہے جو اپنے وجود کے لئے کسی اور وجود کی محتاج نہ ہو چنانچہ خدا کو اسی معنی میں لامحدود جوہر کہا گیا ہے البتہ نفس و اجسام اضافی جوہر ہیں، نفس کی صفت فکر ہے اور جسم کی ماہیت امتداد ہے امتداد ہی کی وجہ سے یہ تین باتیں لازم آتی ہیں۔

۱۔ امتداد بغیر جسم کے محال ہے یعنی فضائے خالی یا خلا ناممکن ہے۔

۲۔ مادی دنیا لامحدود ہے (یہاں ارسطو کی پوری پوری تردید ہو جاتی ہے)۔

۳۔ جسم لامرکز ہوتا ہے کیونکہ مرکز ایک ہندسی نقطہ ہوتا ہے اور نقطہ غیر ممتد ہے۔

ڈیکارٹ اجسام کی بذات خود حرکت کا سخت مخالف تھا اس کا ایقان تھا کہ اجسام منفعل ہوتے ہیں اور مادی دنیا میں قانون جبر کے سوا کوئی قانون نہیں۔ دنیا کی حالت صرف ایک مشین کی سی ہے اور غیر متناہی اور غیر معین سلسلہ حرکات کا مبدا، خدا کی ذات ہے۔

نفس کی حد تک بتلایا جا چکا ہے کہ نفس میں نہ صرف فکر ہے بلکہ حرکت بھی ہے اس طرح سے وہ صاحب اختیار ہے نفس کے اس طرح صاحب اختیار اور ذی فکر ہونے اور اجسام کے منفعل اور غیر ذی فکر ہوتے سے ڈیکارٹ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نفس کا جسم پر اثر ہو رہا ہے مگر یہ کہنا بڑی غلطی ہوگی کہ یہ دونوں متحد ہیں کیونکہ اشیاء کو متحد خیال کرنا ان کو ایک ہی تصور کرنا ہے اسی چیز کو اس نے اپنی ایک اور کتاب میں جو کہ اس کی وفات کے بعد شایع ہوئی تھی اس طرح واضح کیا ہے کہ۔

"جسم چلتا پھرتا کھاتا پیتا اور سانس لیتا ہے، روح لطف اٹھاتی ہے، تکلیف اٹھاتی ہے، خواہش کرتی ہے بھوک اور پیاس محسوس کرتی ہے محبت کرتی ہے اور امید کرتی ہے اور خوف کھاتی ہے کبھی جاگتی ہے اور کبھی سوتی ہے مگر یہ تمام اثرات نتائج ہیں ان حرکات کے جو دماغ میں حیوانی جذبات کی آمد و رفت سے پیدا ہوتی ہیں۔ دماغ کے بغیر یہ اثرات غائب ہو جائیں گے۔

اور روح میں فکر کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا، تصور غیر مادی ہے اور شئے مادی چیز
مادی صفت کا تصور شئے سے ایسے ہی مختلف ہے جیسے کہ سوئی چبھنے کا درد سوئی سے"۔

**محمد قدرت اللہ**
متعلم بی۔ اے (آخری)
صدر بزم فلسفہ

# عمرانیات کیا ہے

انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ہر پہلو کی تحقیق کے لئے ایک علم موجود ہے چنانچہ معاشی، سیاسی، اخلاقی، نفسی، اور مذہبی نقاط نظر سے ہماری زندگی کے شعبوں کی جانچ کے لئے علی الترتیب علم معاشیات، سیاسیات، اخلاقیات نفسیات اور دینیات کا وجود عمل میں آیا ہے ان علوم کا مقصد انسان کی زندگی کو بہتر سے بہتر طریقے پر سنوارنا ہے زندگی کے مختلف پیچیدہ مسائل کو حل کر کے لائحہ عمل پیش کرنا ہے آج کل تحقیق کا ذوق و شوق اتنا ترقی کرتا جا رہا ہے کہ دن بدن نئے علوم و فنون کا اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ علم سائنس میں ارضیات، حیاتیات، نباتیات، حیوانیات اور سمکیات کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے۔ لیکن اب تک کوئی ایسا علم نہیں تھا جو ہماری زندگی کی سماجی نقطۂ نظر سے تحقیق کرے اور سماجی پہلو کا تجزیہ کرے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اسی لئے روسو نے بھی یہی نعرہ لگایا تھا کہ انسان، سماجی حیوان، Social animal ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ہمارے سماج اور سماجی زندگی کی نشو و نما کے لئے ابتدائی زمانے ہی سے کوشش کیجا رہی ہے اور یہ کوشش اس وقت سے جاری ہے جب کہ ہمارے آبا و اجداد مل جل کر رہنے بسنے لگے۔ لیکن اس اجتماعی زندگی کے مظاہر کو واضح کرنے کے لئے کوئی علم موجود نہیں تھا۔ مذہبی، سیاسی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی لحاظ سے معاشرہ کے متعلق جزوی خیالات کا اظہار کیا گیا اور معاشرتی ارتقاء کے دوران میں ارباب فکر نے حکومت، قانون اور عام نظام اجتماعی کے بہت سے اصول ترتیب دیئے اور سماج کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے مختلف اصول و قوانین سے کام لیا گیا۔ بالآخر انھیں ہماری زندگی کی پیچیدگیوں کا احساس ہونے لگا اور اس کے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے اور ان مسائل کو سلجھانے کے لئے مختلف علوم و فنون کے ذریعہ زندگی کی تخصیص کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر علم اپنے دائرہ میں رہ کر اپنے موضوع کے مطابق زندگی کی پیچیدگیوں کو حل کرنے لگا اسی طرح ارباب فکر و نظر نے ہمارے سماج کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ایک علم کی ضرورت

محسوس کی اور اس کو "معاشرتی ماحول کا علم" قرار دیا گیا۔ اور بعضوں نے اس کو "معاشرتی ترقی کا علم" کہا ہے۔ لیکن اگست کونت نے ۱۸۳۲ء میں اپنی کتاب "فلسفۂ ایجابی کے اسباق" کی چوتھی جلد میں "معاشرتی ماحول" یا "معاشرتی ترقی" کے علم کو "عمرانیات" کے نام سے موسوم کیا بعد میں چل کر یہ لفظ "سماجیات" اور "اجتماعیات" کے نام سے بھی موسوم ہوا لیکن "عمرانیات" کا لفظ آج کل اتنا مقبول ہوا کہ یہ دونوں الفاظ شاذونادر ہی سننے میں آتے ہیں۔ اب کونت کے زمانے ہی سے اس علم کو جداگانہ حیثیت دی گئی جس طرح علوم عمرانی پر معاشیات، سیاسیات، اخلاقیات، دینیات، تاریخ، نفسیات اور جمالیات شامل ہیں اسی طرح عمرانیات بھی علوم عمرانی ایک شاخ ہے جس کو اٹھارویں صدی علمی حیثیت اور جداگانہ رتبہ دیا گیا۔ کونت نے اس علم کی ترویج اور اس کی نشوونما کے لئے مختلف کلیات، نظریے، اور اصول و قوانین کا خاکہ چھوڑا ہے۔ اس لحاظ سے کونت اس علم کا "نقیب" ہے اور ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں "عمرانیات کونت کے نصب کئے ہوئے سنگ بنیاد پر قایم ہے"۔ ہمیں اس کا ممنون ہونا چاہئے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور معاشرتی مظاہر کے لئے ایک علم کی تدوین کی۔ اس نے حیاتیات اور عمرانیات کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے آنے والی نسلوں کے لئے مختلف عمرانیاتی اور معاشرتی نظریوں کا مکمل دائرہ کھینچا ہے "نظریہ ارتقار ذہنی" "نظریہ حرکی و سکونی عمرانیات" اور "نظریہ ربط" عمرانیات کی تدوین کے لئے اس کے نزدیک ضروری ہیں۔ اس نے عمرانیات کی دو قسمیں کی ہیں ایک حرکی عمرانیات اور دوسری سکونی عمرانیات اس کی ذہن میں جسم اجتماعی اور سماج کا تصور "جسم نامی" سے زیادہ نہ تھا۔ جس طرح انسان کا جسم مختلف امراض اور حالات سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح اس کا بھی خیال تھا کہ سماج مختلف حالتوں اور زمانوں میں مختلف رہتا ہے۔ ہمارے سماج کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس میں لچک کی خاصیت پائی ہے، ترقی اور تنزل دونوں ہم رکاب رہتے ہیں۔ اسی ترقی و تنزل کے اسباب و علل کو بیان کرنا عمرانیات کا کام ہے۔

کونت کے اس علم کی بنیاد پر ہربرٹ اسپنسر نے عمرانیات کی تعمیر شروع کر دی اگرچہ اس کے عمرانیاتی نظرئے کونت کے بنیادی اصولوں سے مختلف تھے۔ لیکن ان اصولوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس نئے علم میں ترقی کی لہر دوڑا دی اس نے استقراء کے ذریعہ اس علم کی تدوین

کو ثابت کر دکھایا۔ بعض عمرانیین کا یہ خیال ہے اس نے کھینچ تان کر معاشرہ کا حیاتیاتی تصور قائم کیا ہے وہ معاشرہ کو "جسم حیوانی" قرار دیتا ہے اور اس کو جسم اجتماعی کے مقابلے میں ترجیح دیتا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ "جسم اجتماعی" "جسم حیوانی" کی طرح نشو و نما پاتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا یہ اصول تھا کہ معاشرے کے متعلق معلومات اور معطیات جمع کر کے استقراء کے ذریعہ سے عمرانیات کی تدوین کرے۔ ابتداء میں یہ اصول مفید ثابت ہوا۔ لیکن "مشاہدہ" کے نامکمل رہ جانے سے معاشرے کے نفسیاتی عنصر کو نظر انداز کیا گیا۔ یہاں یہ اچھی طرح واضح رہے معاشرے کی تحقیقات میں طبعی اور نفسیاتی دونوں طرح کے واقعات اور مظاہر کو منظم طریقے پر جمع کرنا انتہائی ضروری ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ عمرانیات خالص فلسفہ یا مجرد نفسیات نہ بن جائے۔ اسپنسر نے اپنی کتاب "بیانی عمرانیات" میں صرف معاشرے کو اور اس کے واقعات کو "جسم حیوانی" کے نقطۂ نظر سے جانچا ہے طبعی اور نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے اس کی اس کتاب کو ہم صرف ایک علمی جد و جہد کہہ سکتے ہیں ورنہ اس کتاب سے کوئی خاص نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ البتہ اس میں اس کی تلافی اپنی دوسری کتاب "اصول عمرانیات" اور ایک تشریحی رسالے "مطالعہ عمرانیات" میں کر دی ہے۔ ان دونوں میں اس نے عمرانیات کی باضابطہ بحث کی ہے اور "عمرانی سکونیات" لکھ کر اہم عمرانیاتی مسائل پیش کئے ہیں۔ کونت کے نظریۂ ارتقائی ذہنی" کی طرح اس نے ایک اہم نظریہ "نظریۂ انفرادیت" پیش کیا ہے لیکن عمرانیین نے اس نظریے کے خلاف یہ آواز بلند کی کہ اس نظریے سے سماج غلط اثرات کا شکار ہوتا ہے سماج میں اجتماعیت کا فقدان ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے سماج ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا اور "حرکی" کے بجائے "سکونی" نظریے اور اعمال کام کرتے رہیں گے۔ اس لئے انھوں نے اس "نظریۂ انفرادیت" کے خلاف "نظریہ اجتماعیت" پیش کیا اس نظریے کے حامیوں نے قابل ذکر لڈوگ گیلوئمنز ہے۔ بہرکیف اسپنسر کی عمرانیاتی خدمات عمرانیات کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھی جائیں گی کیونکہ کونت کے بعد صرف اسپنسر ہی وہ عالم ہے جس نے عمرانیات کو عملی طور پر تشکیل دی اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ عمرانیات کی نشو و نما اور اہمیت بتلانے میں کافی سے زیادہ حصہ لیا۔ اسپنسر کے بعد مختلف عمرانیین نے عمرانیات کی مختلف خدمات انجام دی ہیں۔

جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر گیبرل تارڈ، ایل ورکھائیم، گستاؤ لیبان، رینے ورمس، لڈوگ گپلوتل، البرٹ شافلے، ای اے۔ اس، پروفیسر گڈ انگز اور لسٹر وارڈ وغیرہ ہیں۔

متذکرۂ بالا ماہرین کی ہی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے سماجی اعمال کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک علم کی تشکیل ہوئی جس کا موضوع "معاشرہ" ہے ہم اس جدید علم کے ذریعہ سماج کے مختلف قسم کے حالات اور کیفیات سے واقف ہو کر سماج کو ترقی کی راہ پر لگا سکتے ہیں اور فرسودہ نظام اور قدیم اصول و قوانین سے سماج کو دور رکھ سکتے ہیں کیونکہ عمرانیات کا یہ اٹل اصول ہے کہ "معاشرہ" ہمیشہ زمانے کے حالات، کیفیات اور حوادث کا تابع رہتا ہے"۔ عمرانیات کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اجتماع انسانی کے عام تحقیق سے تعلق رکھے اس لیے ای ایل ورکھائیم نے عمرانیات کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ "عمرانیات علوم اجتماعی کے لئے بمنزلہ ضابطہ نظام ہے" (لے مبادی عمرانیات از رینے ورمس صفحہ ۱۹) وہ ساری چیزیں جن میں معاشرے کی ابتدا، نشوونما، ساخت اور وظائف سے تعلق ہے عمرانیات کے دائرہ تحقیق ہیں یہ علم ان کے ارتقاء پر نظر رکھتا ہے، معاشرے کے مختلف حصوں، شعبوں اور ان کے باہمی تعلقات کا معاشرتی اعمال اور ان کے باہمی رابطوں کا معاشرے کے نصب العین اور نفس اجتماعی اور نفس انفرادی کی جد وجہد کا مطالعہ کرتا ہے، معاشرتی قوتوں کو دیکھ کر اور ان قوانین کو معلوم کر کے جو سماج میں کارفرما ہیں، مفید نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اور اس علم کا یہ کام ہے کہ معاشرے کی جانچ اور تحقیق کرنے کے بعد اجتماعی اعمال کو اپنے مفید اصول و قوانین پر ڈھالے۔ عمرانیات ایسے تصورات کو پیش کرتا ہے جس میں معاشرہ کی آئندہ نشوونما اور فلاح و بہبود ہو اور ایسے تصورات کے تجزیہ کی دعوت دیتا ہے جس سے مفید کام نکل سکتے ہیں۔ معاشرہ کے گرد و پیش کے واقعات اور افراد کی زندگی کے حالات ایک نظام میں ترتیب دینا عمرانیات کا کام ہے۔ متعدد دستوری اصلاحات، سیاسی آئین، معاشی قواعد و ضوابط اور تجارتی اصولوں سے جب سماج متاثر ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک عظیم تغیر واقع ہوتا ہے تو جو مظاہر اور کیفیات ظہور پذیر ہوتے ہیں، انہیں منظم طور پر پیش کرنا اور ان پر سیر حاصل بحث کرنا عمرانیات ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ عمرانیات سماج کی مرفہ الحالی کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتا ہے اور مرفہ الحالی اور خوشحالی کے متعلق

مختلف تجاویز اور لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ اس علم میں جماعت گروہ اور ادارے کے اعمال کی جانچ کی جاتی ہے اور حسب ذیل معاشرے کے اجزائے ترکیبی کا بہت ہی گہری نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کے حفظ و بقا کے لئے عملی پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۔ پرورش کرنے والی جماعتیں (۱) خام اجناس پیدا کرنے والی جماعتیں (ب) قدرتی خزانوں کو حاصل کرنے والی جماعتیں (ج) صناع (ایک شے کو دوسری بنانے والی جماعتیں) (د) نقل و حمل کرنے والی جماعتیں (ہ) مبادلہ کرنے والی جماعتیں۔ ۲۔ بقائے نسل کی ضامن جماعتیں (ا) خاندان (ب) طبی انجمنیں (ج) حفظان صحت کی انجمنیں ۳۔ اطلاع رسانی کے نظام (جو معاشی جماعتوں کے لئے ناگزیر ہیں) (ا) مطبع اور اس کے متعلقات کتابیں، اخبار، رسالے وغیرہ (ب) ٹیلیفون کا انتظام کرنے والی جماعتیں (ج) تار کا انتظام کرنے والی جماعتیں ۴۔ تہذیبی جماعتیں (ا) کلب (ب) تعلیمی ادارے (ج) ادبی جمالی اخلاقی انجمنیں (د) علمی انجمنیں (ہ) مجلسی انجمنیں (و) تفریحی انجمنیں۔ ۵۔ تنظیم اور حفظ امن کا انتظام (ا) بین الاقوامی انجمنیں (ب) ریاست (ج) وضع قوانین کے ادارے۔ (د) عدالتیں (ہ) انتظامی ادارے (و) پولیس (ز) سرکاری سررشتہ تعلیم و طبابت (ح) مزدوروں کی انجمنیں اور امداد باہمی کی انجمنیں (ط) بیمہ کمپنیاں، مذہبی ادارے، (ی) خیراتی ادارے اور سیاسی جماعتیں۔

معاشرے کے ان اجزائے ترکیبی کی تحقیق کے لئے عمرانئین کو دیگر علوم عمرانی مثلاً معاشیات، سیاسیات، نفسیات، جمالیات، اخلاقیات، فلسفہ، تاریخ اور علم الانسان وغیرہ سے امداد لینا اور ان کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے کیونکہ مکمل عمرانیات وہ کہلائے گی جو ان سب علوم سے استفادہ کرتے ہوئے ان اجزا کو جو معیار تحقیق پر پورے اتریں، منطقی ترتیب کے ساتھ ایک نظام کی صورت میں لے آئے یہاں یہ بات واضح رہے کہ اگر عمرانیات دوسرے علوم کے نتائج تحقیق سے امداد لے تو اس کی قدر و قیمت نہیں گھٹیگی کیونکہ علم عمرانیات کے عام قوانین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ اپنا ایک مستقل اور مخصوص مقصد اور ایک معین موضوع رکھتا ہے۔ اس لئے ہربرٹ اسپنسر نے عمرانیات کے متعلق کہا تھا کہ

"عمرانیات ان علوم اجتماعی میں سے ایک ہے جو دیگر علوم اجتماعی پر حاوی ہے

اور دوسرے علوم کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتا ہے ۔عمرانیات کا موضوع وہ عام قوانین ہیں جو پورے جسم اجتماعی پر نافذ ہیں ۔ یہ ایک مستقل علم ہے جو ایک جداگانہ وجود اور دائرہ تحقیق رکھتا ہے اور اپنی تحقیق کے لئے اسے معاشیات، اخلاقیات، سیاسات، حیاتیات اور نفسیات سے مدد لینی پڑتی ہے۔"

اسی طرح عمرانیئین کو مختلف اداروں اور جماعتوں کی سماجی سرگرمی کو پیش کرنے کے سلسلے میں نہ صرف صنعت، تجارت، رائے عامہ، تعلیم اور مذہب کے ساتھ تعاون عمل کرنا پڑتا ہے بلکہ آبادی، تقسیم دولت، پیدائش دولت، تقسیم محنت، تقسیم کارکردگی اور اجرت، مبادلہ، سماجی تنظیم اور اجتماعی شعور وغیرہ کے متعلق کافی چھان بین کرنی پڑتی ہے اور سماجی محرکات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد "سماج سدھار" کے لئے عملی پروگرام پیش کرنا پڑتا ہے۔

عمرانیات کے موضوع "معاشرہ" کے متعلق کافی تحقیق کے باوجود اس علم کو متعدد نقاط نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان میں سب سے ممتاز موسیو تارد ہے جس نے اپنی کتاب "قانون تقلید" میں عمرانی قوانین کا ذکر کرتے ہوئے عمرانیات کو تین بنیادی تصورات یعنی "معاودت، تضاد اور تطابق" میں محدود کر دیا ہے۔ پروفیسر گڈنگز نے "اصول عمرانیات" میں اس علم کا مطالعہ صرف ایک بنیادی اصول "احساس نوعی" کے نقطہ نظر سے کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عمرانیات کے متعلق یہ تصورات اہمیت رکھتے ہیں مگر اس علم کا موضوع "معاشرہ" اتنا وسیع ہے کہ ان میں سے کوئی تصور اس پر پوری طرح حاوی نہیں ہو سکتا جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اس علم کا مقصد سماج کے مختلف واقعات کو جمع کرنا اور انھیں منظم طریقہ پر ترتیب دینا معاشرہ کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنا، معاشرہ کے تنزل و بقا کے اسباب و تدابیر معلوم کرنا، اجتماعی اور انفرادی مفاد کے لئے طریقے پیش کرنا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر گڈنگز کی عمرانیات کی یہ جامع تعریف بہت معقول معلوم ہوتی ہے۔

"عمرانیات ایک کوشش ہے اس بات کی کہ طبعی، حیاتی اور نفسی اسباب کے متحدہ عمل ارتقا کے لحاظ سے معاشرے کی ابتداء اور نشو و نما اس کی ساخت اور جدوجہد کی توجیہہ کی جائے۔"[1] (1 مبادی عمرانیات مصنفہ گڈنگز صفحہ ۱۰)

علمائے عمرانیات نے سہولت اور آسانی کی خاطر عمرانیات کی ذیلی قسمیں کی ہیں تاکہ معاشرہ کی فلاح وبہبود اور مرفہ الحالی کا معیار قائم کرنے میں آسانی ہو اس کے علاوہ اس میں عوام کی تفہیم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ عمرانیات کی تقسیم کی ابتدا بھی کونت نے کی تھی اس کے بعد رفتہ رفتہ، اس کی تقلید کی جانے لگی مثلاً بیانی عمرانیات، نظری عمرانیات، عملی عمرانیات، شہری عمرانیات، دیہی عمرانیات وغیرہ کونت کے بعد کی تقسیم ہے۔ بیانی عمرانیات میں تربیت یافتہ و نیم تربیت یافتہ اور وحشی قبائل کے رسوم و رواج، عادات و اطوار، اعتقادات اور توہمات بالتفصیل بیان کئے جاتے ہیں اور ان کی اصلاح کے تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اسی طرح نظری عمرانیات میں معاشرہ کی تشریح، قومی اور بین الاقوامی تخیلات پر تبصرہ، عادات و اطوار اور رسوم و رواج کی تحقیق و تدوین، خاندان، فرقہ، جماعت، طبقہ اور قوم پر تنقید و تبصرہ، نفس انفرادی و اجتماعی کی چھان بین، عمرانیت اور سماجیت کے ذرائع معلوم کرنا، استحصال اور اس کے اقسام و قوانین، اور تجدید کا مفہوم اور اس کی اقسام جیسے امور پر بحث و تمحیص کی جاتی ہے۔ عملی عمرانیات میں "معاشرتی امراض" پر بحث ہوتی ہے اور ان امراض کو دور کرنے کے لئے مختلف ترکیبیں اور تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ ان معاشرتی امراض میں عیوب و جرائم اور اس کے اسباب اور انسداد کے طریقے، افلاس کے اسباب اور اس کو دور کرنے کی تدابیر، بیروزگاری کے وجوہ اور اس کو دور کرنے کے طریقے، خیرات اور اس کی تنظیم، مرفہ الحالی اور اس کے اختیار کرنے کے طریقے، گداگری کا انسداد، معاشرتی تنزل اس کے ترقی کے تدابیر، تعلیمی طریقے اور اس کی مختلف خرابیاں وغیرہ جیسے مسائل شامل ہیں۔

شہری اور دیہی عمرانیات میں معاشرتی اور سماجی خرابیوں اور باشندوں کی ہر جہتی ترقی کا خصوصیت سے خیال رکھا جاتا ہے۔ تعلیمی، معاشرتی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی، نفسی اور سماجی نقاط نظر سے افراد کی زندگی پر غور و فکر کیا جاتا ہے اور شدید طور پر اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ "حزکی آبادی" یعنی ترقی یافتہ آبادی کے دوش بدوش "مدسکونی آبادی" کو کھڑا کیا جائے۔

سماجی مرفہ الحالی اور معاشرتی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لئے عمرانیات نے چند عمرانی قوانین نافذ کیے

تارد نے اپنی کتاب "عمرانی قوانین" میں یہ کوشش کی ہے کہ معاشرتی قوتوں کے نظم وضبط کو برقرار رکھنے کیلئے بار بار واقع ہونے والے مظاہر دریافت کئے جائیں شلاً یہ کہ اگر ہئیت دان اجرام سماوی کی کسی حرکت کا مشاہدہ کرتا ہے اب اگر اس حرکت کا اعادہ نہ ہو تو اس سے کوئی علمی نتائج نہیں نکالے جاسکتے اسی طرح معاشرتی قوتوں اور سماج کی حرکی حالت کا بار بار مطالعہ نہ کریں تو ہم معاشرتی قوتوں میں کسی قسم کی تجدید نہیں کرسکتے۔

علم عمرانیات میں سماج کی نشو ونما کے لئے انفرادی انتخاب کے اجتماعی انتخاب کے اجتماعی نصب العین کے، تقلید کے، شعوری مشابہت کے، ہمدردی کے، اضطراری عمل اجتماعی کے، روایات کے، بقا اور ترقی کے اور عدل و انصاف کے قوانین موجود ہیں۔

عمرانیات کے پس منظر سے واقف ہونے کے بعد اب ہمیں اس علم کی اہمیت اور ضرورت میں مطلق سیر نہیں ہوسکتا۔ چونکہ یہ جدید علم ہے اس لئے اکثر لوگ اس کی اہمیت اور ضرورت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس کو صرف اس خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے کہ یہ علوم عمرانی کا امتزاج ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف علوم عمرانی کا مجموعہ یا امتزاج ہی نہیں بلکہ یہ ایک علحدہ اور مستقل علم ہے اس علم کا احساس علوم عمرانی کے ماہرین کو قرون وسطیٰ ہی میں ہوچکا تھا انقلاب فرانس نے عوام پر یہ بات ظاہر کردی کہ شخصیت اور انفرادیت کی بجائے جمہوریت اور اجتماعیت کا راج ہو اور اب تو عوام میں یہ احساس دن بدن ترقی کرتا جارہا ہے کہ پس ماندہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آجائیں، تمام ممالک میں خوشحالی، مرفہ الحالی اور امن عامہ کا مظاہرہ ہو اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ محض حاکمیت اور قانون کے دباؤ کے ذریعہ قومی جذبات کو مقید کیا جاسکے قوموں کے دلوں میں بیداری اور احساس برتری کے جذبات موجیں مار رہے ہیں اور وہ اپنے سماج کو غلامی کی زنجیروں اور فرسودہ نظام سے بالکل پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ مفلسی بیروزگاری تراج کسادبازاری اور جا و بیجا قانون کی غلط پابندی کے خلاف ایک مفید محاذ تیار کیا جارہا ہے۔ قومیت یا آزادی، مساوات اور اخوت کے بغیر بلند کئے جارہے ہیں۔ تقسیم دولت صرف دولت اور مبادلۂ اشیاء کے ساتھ عملی طور پر انصاف اور عدل کا مطالبہ ہورہا ہے۔

غرض یہ اس بحرانی دور میں ہمیں ایسے علم کی سخت ضرورت ہے جس میں جماعتوں کی ذہنیت کا پتہ

چلے، نفس اجتماعی اور رائے عامہ سے خصوصیت سے واقفیت حاصل ہو، سماج کے انقلابات، تغیر اور حادثات سے کامل طور پر آگاہی ہو۔ یہ تمام مظاہر عمرانیات کے ذریعہ ہی معلوم ہوسکتے ہیں جب اس علم کی تحقیق و تشہیر اور مقبولیت وسیع پیمانے پر ہو جائیگی تو اس کی اہمیت اور ضرورت کا احساس شدید طور پر ہونے لگے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ متعدد دستوری اصلاحات، سیاسی آئین، معاشی قواعد اور تجارتی ضوابط قوم کی سماجی کمزوریوں کیوجہ سے ناکام ثابت ہوتے رہتے ہیں اس لیے عمرانیات کے ایک دبستان کا خیال ہے کہ قوم کی خوبیوں کا سرچشمہ اس قوم کا معاشرہ ہے قوم کی ترقی و زوال کا انحصار سماج ہی پر ہے۔ بہتر سے بہتر اصول اور اعلیٰ سے اعلیٰ قوانین اکثر بیکار ثابت ہوتے ہیں جب کہ سماج میں ان اصولوں کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو اس لئے عمرانیین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ سماج کی خرابیوں کو دور کرکے بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ اصول و قوانین جاری کریں۔

عمرانیات کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے "مرفہ الحالی" کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اس میں سماج سدھار کے لئے مختلف اصول و ضوابط مرتب کئے جاتے ہیں۔ عمرانیات کے مطالعہ سے قوت فیصلہ اور قوت مشاہدہ ترقی کرتی ہے ان دو قوتوں کے بغیر ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم ملک و قوم کی سیاسی، معاشی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی مسائل کو سمجھ سکیں۔ مسائل حاضرہ کو سمجھنا اور سمجھانا اور انھیں سلجھانا عمرانیات کے اچھے طالب علم کے لئے کچھ دشوار نہیں کیونکہ عمرانیات کے مطالعہ سے اس کا ذہن فہم عامہ اور تفہیم کا عادی ہوتا ہے اور اس راہ میں اس کا ذہن دن بدن نشو و نما پاتا ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کے مایۂ ناز سپوت پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس علم کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی کتاب "تعلیم کا مسئلہ" میں لکھا ہے کہ

"........ اس (نفسیات) سے بھی او نچے زینے پر عمرانیات کا علم ہے جو ایک فرد کے نفس سے نہیں بلکہ ایک جماعت یا گروہ کے نفس سے بحث کرتا ہے اور اس طرح

یہ جماعت بلکہ ساری نوع انسان پر حاوی ہوتی ہے ...... انسانوں کے لئے سب سے کم تر ضرورت اور قریبی تعلق رکھنے والا علم ریاضی کا اور سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے والا علم عمرانیات کا ہے جس میں تاریخ و معاشیات وغیرہ شامل ہیں لیکن یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ صحیح اور زیادہ ترقی یافتہ علم ریاضی اور سب سے کم صحیح اور کم ترقی یافتہ علم عمرانیات ہے"

یورپ کی جامعات میں اس علم کو روز بروز فروغ دیا جا رہا ہے حتیٰ کہ وہاں سے قابل عمرانیین پیدا ہو رہے ہیں لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان کی جامعات میں اس علم کی طرف ذیلی طور پر توجہ دی جا رہی ہے۔ ہم ہندوستان کے ارباب جامعات اور بالخصوص ہماری ہردلعزیز جامعہ عثمانیہ کے ارباب حل وعقد سے توقع کرتے ہیں کہ وہ عمرانیات کے شعبے قایم کریں گے جو ملک وقوم کی ترقی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

محمد مصلح الدین صدیقی

متعلم بی۔اے (ابتدائی)

# دختران جامعہ کی اُردو خدمات

آج سے دس سال پہلے ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ نے انجمن طیلسانین کی پہلی سالانہ کانفرنس میں جو ۱۱ دسمبر ۱۹۵۳ء کو منعقد ہوئی تھی "جامعۂ عثمانیہ کے فرزندوں کی اُردو خدمات" پر ایک مقالہ سنایا تھا، جو بعد میں شائع بھی ہوگیا، اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے صرف فرزندان جامعہ کے پندرہ سالہ اُردو کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں ہم دختران جامعۂ عثمانیہ کی اُردو خدمات کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

جامعۂ عثمانیہ کو قائم ہوکر صرف پچیس سال کا قلیل عرصہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تھوڑی سی مدّت میں کسی جامعہ سے بھی معتد بہ مستخرجین کی توقع نہیں کی جاسکتی، اور پھر ان مستخرجین میں ایسے کتنے ہوتے ہیں جو علم کی خدمت گزاری کا بار اپنے دوش پر لیتے ہیں۔ یہاں تو ہمیں صرف صنفِ نازک کے کارناموں کا تذکرہ کرنا ہے، جنہوں نے جامعہ کے قائم ہونے کے پانچ سال بعد استفادہ کا آغاز کیا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ امر قابلِ ستائش اور لائقِ توصیف ہے کہ قلیل عرصہ میں بھی انہوں نے بہت کچھ کام کیا ہے اور اپنے تابناک کارناموں سے دنیائے اُردو میں اپنی جگہ قائم کرلی ہے۔

جامعۂ عثمانیہ سے طیلسان لینے والی پہلی خاتون نوشابہ خاتون ہیں۔ جنہوں نے کلیۂ اناث

(زنانہ کالج) کے قائم ہونے کے پہلے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ۱۳۴۳ف ۱۹۲۴ء میں کلیۂ اناث قائم ہوا۔ اس بیس سال کے عرصہ میں کئی خواتین نے ایم اے اور ایم ایس سی کی ڈگریاں حاصل کیں اور قابلِ قدر مقالات بھی قلم بند کئے ہیں۔

دکن سات سو سال سے اردو زبان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے اور دکن کی سرزمین نے صدہا نام آور شاعر پیدا کئے جنھوں نے ملک سخن میں داد سخنوری دی، ایک زمانہ تھا کہ نظامیؔ، فیروزؔ، وجہیؔ، سلطان قلیؔ، غواصیؔ، ابن نشاطیؔ، رستمیؔ، نصرتیؔ، شاہیؔ وغیرہ اپنے کلام معجز بیان سے اُردو زبان کی آبیاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد ولیؔ، سراجؔ، داؤدؔ، فضلیؔ، آزادؔ، ذوقیؔ، رغیؔ وغیرہ کی سخن سنجی نے گلستانِ ادب اُردو میں سدا بہار پھول کھلائے پھر شاداں کی بزم شعر و سخن آراستہ ہوئی جس میں ایماؔ، قیسؔ، صفاؔ، ایماںؔ، احساںؔ، چندؔ آدیفرہ کے علاوہ حفیظؔ اور نصیرؔ وغیرہ شمالی ہند کے شعرا بھی اپنے کمالِ فن کی داد لینے میں مصروف رہے پھر حضرت فیضؔ کا فیض جاری ہوا۔ اس کے بعد داغؔ، امیرؔ، ظہیرؔ نے دکن ہی کو اپنا ملجا و ماویٰ قرار دے لیا۔

نظم کے ساتھ ساتھ اُردو نثر کی جو خدمت دکن نے بجا لائی وہ بھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ وجہی کی "سب رس" ابتدائی نثر اردو کی شہ کار ہے۔ اس کے بعد انوارِ سہیلی، بہارِ دانش اخلاقِ ہندی جیسی ادبی کتابیں مرتب ہوئیں پھر شمس الاُمرا کی قدردانی نے مغربی علوم سے اُردو زبان کو آراستہ کیا۔ سائنس، ریاضی اور علم ہیئت کی بے شمار کتابیں عالمِ وجود میں آئیں۔ غرض کہ زبان اُردو کا جو کاروان صدیوں سے منزل کی جانب رواں تھا وہ بالآخر جامعہ عثمانیہ کی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اور آج اس کے فرزند اور دختریں بساطِ ادب اُردو پر انواع و اقسام کی جنس گراں مایہ پیش کر رہے ہیں، جن کی درخشانی اور تابانی دنیائے اُردو میں عرصہ دراز تک ضیا پاشی میں مصروف رہیگی۔

دختران جامعہ عثمانیہ کی اُردو خدمات کی تفصیلی صراحت دشواری سے خالی نہیں ہے اس کام کو کوئی دختر جامعہ ہی زیادہ بہتر اور عمدگی کے ساتھ انجام دے سکتی ہے۔ مگر "نیرؔ صاحب"

ایڈیٹر مجلہ عثمانیہ کی فرمائش کی تعمیل میں مجبوراً قلم اٹھایا گیا ہے۔ اگر اس میں خامی نظر آئے تو اس کی بازپرس سے ہمیں معاف رکھا جائے۔

دختران جامعۂ عثمانیہ کی اردو خدمات کے ضمن میں مختلف اُمور کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے مثلاً شاعری، نثر نگاری، خطابت، نشری تقریر وغیرہ۔ ان ہی عنوانات کے تحت یہاں صراحت کی جاتی ہے۔

**شاعری** دختران جامعۂ عثمانیہ سے کئی ایک میدان شاعری میں جولانی بتا رہی ہیں۔ سب سے پہلے نوشابہ خاتون کا نام آتا ہے، جنہوں نے اس زمانے میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی جبکہ ہنوز کلیۂ اناث عالم وجود میں نہیں آیا تھا، ان کی قومی و ملکی اور نیچرل نظمیں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے کلام کی سادگی اور جدت تخیل کی پرواز قابل داد ہے۔ کلام سوز و گداز سے مملو ہے۔ ان کا مجموعہ "موجِ تخیل" کے نام سے منظر عام پر بھی آچکا ہے۔

لطیف النساء بیگم لطیف کی شاعری بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی ہے، ان کی نظمیں جو چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں عنقریب شائع ہونے والی ہیں لطیف کی نظمیں صاف اور عام فہم ہوتی ہیں۔

جہاں بانو بیگم نقوی بھی میدان شاعری میں اپنے نقش ثبت کرتی ہیں۔ ان کی نظمیں اور رباعیات فن شاعری کا بہترین سرمایہ ہیں، خیالات کی بلند پروازی، اسلوب بیان کی ندرت، صفائی اور پاکیزگی ان کے کلام کے جوہر ہیں۔

احمد النساء بیگم ثریا جبین اپنی کم سنی سے شعر گوئی کی طرف مائل ہیں، کالج کے جلسوں وغیرہ میں ان کی نظمیں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ثریا جبین کا کلام اپنی صفائی اور جدت کے لحاظ سے قابل داد ہوتا ہے، کلام میں آمد کی شان موجود ہے۔

شہر بانو بیگم نسرین تخلص کے ساتھ شاعری کرتی ہیں، کلام میں تکلف و تصنع نہیں ہوتا۔

تصدق فاطمہ بیگم کو جو غلام پنجتن صاحب کی دختر ہیں شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ آپ کو اپنے والد سے تلمذ ہے۔ اگرچہ شاعری کی جانب زیادہ توجہ نہیں ہے مگر پھر بھی آپ کا کلام خوبیوں سے مملو ہوتا ہے، ان میں آمد پائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ صفیہ بیگم فریدہ، انوری بیگم انوری نیز کئی موجودہ طالبات مثلاً سلطانہ عزیزہ رفعت، سعیدہ منظہر، بشیر النسا بیگم شمیم وغیرہ شاعری کا اچھا مذاق رکھتی ہیں اور توقع ہے کہ آگے چل کر اپنے کلام کے باعث شہرت حاصل کریں گی۔

دختران جامعۂ عثمانیہ کی شاعری پرانے اسکول سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ زیادہ تر وہ جدید شاعری سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ ان کے کلام میں گل و بلبل شاہد و ساقی پر اظہار خیال نہیں ہوتا، وہ منظر نگاری، موقع نگاری، واقعہ نگاری، قومی و ملکی اور اشتراکی نظمیں وغیرہ موزوں کرتی ہیں۔ ان کے کلام کی بلند پروازی، خیالات کی ندرت اور اسلوب بیان کی جدت، صفائی اور سادگی قابل داد ہوتی ہے۔

**نثر نگاری** دختران جامعہ میں کئی ایک نثر نگاری اور انشاپردازی میں مصروف ہیں پہلے ہم ان کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اب تک شائع ہو کر مقبولیت کی سند حاصل کر چکی ہیں، رفتار خیال، محمد حسین آزاد، رموز خانہ داری، بربط ناہید، عرب اور عربستان۔ یہ پانچوں کتابیں جہاں بانو بیگم نقوی کی تصانیف ہیں، رفتار خیال افسانوں اور ادب لطیف کا مجموعہ ہے۔ اس میں طبعزاد اور ترجمے دونوں شامل ہیں۔ محمد حسین آزاد آپ کا وہ مقالہ ہے جو ایم اے کی ڈگری کے لئے لکھا گیا تھا۔ رموز خانہ داری میں امور خانہ داری کی وضاحت ہے، بربط ناہید ناہید کے خطوط کا مجموعہ ہے، جس کو جہاں بانو بیگم نے مرتب فرمایا ہے۔ عرب اور عربستان میں بچوں کے لئے عرب کے حالات وغیرہ لکھے گئے ہیں۔

ان میں سے ہر ایک کتاب اپنے مضمون کے لحاظ سے قابل قدر ہے، رفتار خیال کے افسانے اور ادب لطیف کے مضامین کئی لحاظ سے قابل تذکرہ ہیں۔ ان میں جو ترجمے ہیں وہ ترجمے نہیں بلکہ اچھے افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں بانو بیگم نے نہایت خوبی سے ان کو اپنا لیا ہے جو طبعزاد افسانے ہیں۔

وہ زیادہ تر نسوانی معاشرت کے متعلق ہیں، ان میں بعض اہم پہلو کو نہایت کامیابی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد تنقیدی حیثیت سے قابل ستائش ہے، اس میں نہ صرف مولانا محمد حسین آزاد کی مفصل سوانح عمری شامل ہے بلکہ ان کی نظم ونثر پر نہایت قابلیت سے تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے، مولانا آزاد کی کتابوں پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں نہایت خوبی کے ساتھ اس کی تردید کی گئی ہے، بربط ناہید کے خطوط نہ صرف ادبی حیثیت سے دلچسپ اور دلکش ہیں بلکہ اس میں سماج کی دُکھتی ہوئی رگوں پر نشتر کیا گیا ہے پھر ان کی شوخی اور رنگینی بھی، جو ظرافت آمیز ہے، اپنی آپ نظیر ہے۔

جہاں بانو بیگم کا ایک بہترین مضمون نذر ولی میں شامل ہے۔ اس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے ہے کہ "یہ مضمون فنی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے بہتر ہے، خصوصاً ادبی حیثیت سے بہت خوب ہے"۔ جہاں بانو بیگم کو ہمیشہ قلم برداشتہ لکھنے کی عادت ہے۔ کسی مضمون کیلئے سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی ان کے اصلاحی مضامین اور افسانے جو اب تک مختلف رسالوں میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ان سے کئی مجموعے مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ "فریب نظر" عنقریب شائع ہوگا۔

"من کی بپتا" اس کی مصنفہ لطیف النساء بیگم ایم اے ہیں۔ اس معاشرتی عنوانات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے شائع ہوئی ہے، ان کا مقالہ، جو ایم، اے کے امتحان کے لئے لکھا گیا تھا "اردو شاعری میں فن تصوف" اپنے مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے قابل تذکرہ ہے۔ یہ مقالہ کافی ضخیم ہے۔ اگرچہ ہنوز شائع نہیں ہوا مگر اس کی اہمیت کا اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ درجۂ اوّل میں کامیاب ہوئیں۔ "نذر ولی" میں لطیف النساء بیگم کا بلند پایہ مضمون "ولی کا تخیل" شامل ہے۔

"نذر ولی" میں چار مضمون شامل ہیں۔ پہلا مضمون "ولی کا تخیل" دوسرا مضمون "کلامِ ولی اور تصوف" نجم النساء بیگم کا لکھا ہوا ہے، تیسرا مضمون "ولی کی معلومات اور خصوصیاتِ شاعری" کے عنوان سے نعیم النساء بیگم نے مرتب کیا ہے، چوتھا مضمون "ولی کا فنِ شاعری" جہاں بانو بیگم کا لکھا ہوا ہے۔

یہ کتاب ادارۂ ادبیات اُردو کی جانب سے شائع ہوئی ہے ، "تذ ردلی" کو ان خواتین نے اس وقت مرتب کیا ہے جبکہ یہ "ایم اے" کی ڈگری کے لیے زیرتعلیم تھیں۔ اس کتاب کے متعلق مشاہیر ہند اور دکن نے بہترین آراء کا اظہار کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ادب اُردو میں یہ کتاب تنقیدی اور ادبی دونوں حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

"تذر دکن" اگرچہ اس کو سکینہ بیگم صاحبہ نے مرتب کیا ہے اور آپ کو جامعہ عثمانیہ سے تعلق نہیں ہے مگر اس میں کے بیشتر مضامین طالبات جامعہ عثمانیہ کے ہی رہین منت ہیں۔ بعض اہم عنوان یہ ہیں :-

۱۔ دکن کے چند تاجدار شعراء ، ممتاز جہاں بیگم (عثمانیہ)
۲۔ وطنیت تصدق فاطمہ بیگم ( " )
۳۔ دکن ایک نگری جہاں بانو بیگم ( " )
۴۔ حیدرآباد کے مثنوی گو شعراء صفیہ صدیق ( " )
۵۔ حیدرآباد کی چند نامور اہل قلم خواتین، تسنیم ربانی صاحبہ ( " )
(۶) غزل مشاعرہ انجمن ترقی ادب، لطیف النساء بیگم ( " )

اس موقع پر ایم اے کی دوسری طالبات کے مقالوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جن میں سے بعض ممکن ہے جلد شائع ہوکر منظر عام پر جلوہ گر ہو جائیں۔

"مولانا شبلی اور ان کی نثر" اس کی مصنفہ نعیم النساء بیگم ہیں اس میں مولانا شبلی کی سیرت کے علاوہ ان کو بہ حیثیت نثار اور انشاء پرداز پیش کیا گیا ہے۔ مولانا کی جملہ کتابوں پر تفصیلی نوٹ کے ساتھ ساتھ ان پر تبصرہ و تنقید بھی کی گئی ہے۔

"سرسیّد" یہ مقالہ نجم النساء بیگم نے لکھا تھا۔ اس میں سرسیّد اور ان کے کارناموں اور تصانیف کا مفصل تذکرہ ہے۔

دختریں بھی اُردو کی خدمت انجام دے رہی ہیں، ان کی شاعری، نثر نگاری، انشاپردازی نہ صرف ہمت افزا ہے بلکہ ان میں جودت اور امنگ بھی پائی جاتی ہے، یہہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ترقی کے میدان میں فرزندانِ جامعہ کے دوش بدوش ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ وہ مقابلہ کی دوڑ میں آگے بھی نکل جائیں کیونکہ مقابلہ میں وہی بازی لے جاسکتے ہیں جو ہمت، استقلال اور مستعدی کے جوہروں سے آراستہ ہوں۔ جہاں تک ہمیں نظر آرہا ہے ان امور میں دخترانِ جامعہ کا پلڑا ہی بھاری نظر آرہا ہے۔ وما علینا الا البلاغ

نصیرالدین ہاشمی

# پودوں کے مخصوص رنگ

جانوروں کے رنگوں کے مقابلہ میں پودوں کے رنگ کم معین اور کم پیچیدہ بھی ہوتے ہیں۔ لہذا بہ حیثیت مجموعی افادیت کے اصول پر اُن کی توضیح نسبتاً آسان ہے تاہم پھلوں اور پھولوں کے مختلف رنگوں کے فوائد کی تحقیقات کے سلسلے میں ہم قدرت کے عمل کے پوشیدہ ترین گوشوں میں پہنچتے اور عمیق ترین دلچسپی کے اور بے حد پیچیدہ مسائل سے رُودر رُو ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے چارلس ڈارون نے اس دلچسپ موضوع کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے بعد سے اس پر اتنا زیادہ تحقیقاتی کام ہوا ہے اور اتنی زیادہ عام فہم کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ عوام بھی پودوں کے رنگوں کی عام افادیت سے واقف ہو گئے ہیں۔ تاہم اس مختصر سے مضمون میں خاص حقائق دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

بڑے درختوں کے پتوں اور بوٹیوں کے پورے حصّوں کا سبز رنگ ایک مادہ کی موجودگی کی وجہ سے ہوتا ہے جسے کلوروفل کہتے ہیں۔ یہ مادہ سب پتوں میں نُور کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ بالیدگی اور سڑنے گلنے کے دوران میں اس مادہ میں کیمیائی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہمیں موسم بہار کے پتوں اور خزاں کے پتوں کے رنگوں میں فرق نظر آتا ہے۔ یہ معمولی رنگ ہیں جو پودوں کی کیمیائی ترکیب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بعض پودے جو پتھروں میں اُگتے ہیں بالکل پتھروں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تشبّہ Mimicry پودوں کے لئے مفید ہے کیونکہ وہ نباتات خوار حیوانوں کی نظر سے بچ جاتے اور محفوظ رہتے ہیں۔ اگرچہ حقیقی تشبّہ پودوں میں بہت شاذ ہے تاہم ایک جیسے حالات میں مختلف پودے

ایک جیسا توافق ظاہر کرتے ہیں جو دھوکہ دہ ہوتا ہے ۔

جب ہم پودوں کے ضروری حصوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن پر پودوں کے تسلسل اور پھیلاؤ کا انحصار ہوتا ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں اور پھلوں میں رنگ زیادہ تر ایک خاص مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ پھولوں اور کیڑوں کا جو باہمی تعلق ہے اس کی وجہ سے اکثر پھول خوشنما اور دلفریب رنگ کے ہوتے ہیں ان میں اپنے مہمانوں کی رہنمائی کے لئے خاص خاص نشانات پائے جاتے ہیں پھلوں کے رنگ آیا خوشنما یا محافظی ہوتے ہیں ۔ جب یہ مقصود ہوتا ہے کہ بیجوں کا انتشار پرندوں یا دوسرے حیوانوں کے ذریعے عمل میں لایا جائے تو پھل جاذب نظر رنگ کے ہوتے ہیں تاکہ پرند وغیرہ کو راغب کریں ۔ اگر پرندوں اور دوسرے حیوانوں سے بچنا مقصود ہو تو رنگ محافظی ہوتے ہیں ۔ چونکہ پھولوں کے رنگوں کی نسبت پھلوں کے رنگ زیادہ سادہ ہوتے ہیں اس لئے پہلے اُن پر غور کیا جائے گا۔

ہر ایک پھولنے والے پودے کی بقاء اور اس کا وجود اس بات پر منحصر ہے کہ اُس کے بیج بربادی سے بچائے جائیں اور کم و بیش موثر طریقہ سے ایک قابل لحاظ رقبہ پر منتشر کئے جائیں ۔ یہ انتشار آیا میکانی طور پر یا حیوانات کے توسط سے عمل میں لایا جاتا ہے ۔ میکانی انتشار خاص کر ہوا کے ذریعے ہوتا ہے ۔ اس کیلئے بیجوں پر روئیں، کلغیاں، پر یا دوسر توافقات پائے جاتے ہیں ۔ اکثر اوقات بیج اتنے چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں کہ ہوا انہیں آسانی سے دور دراز مقامات تک اُڑا لے جاتی ہے ۔ حیوانوں کے ذریعے منتقل ہونے والے پھلوں یا بیجوں میں قسام کے چھوٹے خار یا آنکڑے پائے جاتے ہیں جو حیوانوں کے جسم سے لگ جاتے ہیں بعض پھل یا بیج چپکٹ ہوتے ہیں ۔ تمام پھل یا بیج جو اس طرح منتشر ہوتے ہیں مدھم اور محافظی رنگ کے ہوتے ہیں ۔ اس لئے جب وہ زمین پر گرتے ہیں تو پہچانے نہیں جاتے ۔ وہ علاوہ چھوٹے اور سخت ہونے کے نہ تو دل فریب ہوتے ہیں اور نہ ان میں نرم رس دار گودا ہوتا ہے ۔ اگر بیج کھانے کے قابل بھی ہوں تو ان میں خوردنی حصّہ بہت کم ہوتا ہے اس لئے جانور انہیں کھانے کی پرواہ تک نہیں کرتے ۔

لیکن ایک خاص قسم کے پھل یا بیج ہوتے ہیں جو اصطلاح میں ( Nuts ) کہلاتے ہیں مثلاً

اخروٹ، برازیل نٹ وغیرہ۔ ان میں خوردنی حصّہ کی بڑی مقدار ہوتی ہے جو ذائقہ میں اچھا اور مقوی ہوتا لیکن اگر پھل کھالیا جائے تو بیج ضائع ہوجاتا ہے اور اس پودے کا وجود معرض خطر میں پڑ جاتا ہے۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ ایسے پھل اتفاق ہی سے خوردنی ہوگئے ہیں اور اس بات کا ثبوت کہ قدرت کا منشاء ان کو کھائے جانے کے لائق بنانے کا نہ تھا اس خاص احتیاط سے ظاہر ہے جو کہ انہیں پوشیدہ اور محفوظ رکھنے کے لیے کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ایسے پھل سب کے سب جب درخت پر کچے ہوتے ہیں تو سبز ہوتے ہیں تاکہ پتّوں سے تمیز نہ ہوسکیں لیکن جب وہ پختہ ہو جاتے ہیں تو بھورے رنگ کے ہوتے ہیں تاکہ جب وہ زمین پر گر پڑیں تو سوکھے ہوئے پتّوں اور ٹہنیوں کے رنگ میں مل جائیں اور اس حالت میں بھی نظر میں نہ پڑسکیں۔ اس احتیاط کے باوجود کہ یہ پھل سخت غلافوں میں لپیٹے ہوئے ہوتے ہیں انہیں زیادہ تر چوپائے اور پرند کھا جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ پھل بڑے اور طویل عمر والے درختوں سے حاصل ہوتے اور عموماً بہت افراط میں لگتے ہیں اس لئے اُن درختوں کی نسل کا تسلسل معرض خطر میں نہیں پڑجاتا جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے بعض صورتوں میں یہ پھل کھانے والے جانور ان کے انتشار میں ممد و معاون ہوسکتے ہیں وہ اس طرح کہ جانور کبھی کبھی پورا بیج نگل جاتے ہیں اور وہ براز میں صحیح و سالم نکل آتا ہے اور اپنی قوت تبتنیت ( Germination ) قائم رکھتا ہے۔ بعض اوقات گلہریاں ایسے پھلوں کو زمین میں دفن کردیتی ہیں اور پھر بھول جاتی ہیں۔ اس لئے یہ پھل ایسے ایسے مقامات پر اگتے اور نشو ونما پاتے ہیں کہ جس کی معمولی حالات کے تحت اُمید نہیں ہوسکتی۔

عام پھلوں میں جو اقسام کے رنگ پائے جاتے ہیں وہ حقیقتاً جاذب نظر ہوتے ہیں اور وہ اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ حیوانات انہیں کھائیں۔ تاکہ بیج جو عموماً گرا دیئے جاتے یا کھائے جانے کے بعد بھی براز میں بغیر ہضم ہوئے کے باہر نکل آتے ہیں اپنی تبتنیت یا اُگنا شروع کریں اور اس طرح نسل بڑھے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اقسام کے توافقات پائے جاتے ہیں۔ یہ پھل رس دار اور مغز دار اور عموماً میٹھے ہوتے ہیں جنہیں بے شمار پرند اور دوسرے حیوانات شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ نمایاں اور شوخ رنگ کے

ہوتے ہیں تاکہ پتّوں یا ماحول سے تمیز کئے جاسکیں سُرخ رنگ سب سے زیادہ عام ہے لیکن زرد، ارغوانی، یا یاسفید پھل بھی کم عام نہیں ہیں پھلوں کا خوردنی حصہ پھولوں کے مختلف حصّوں سے نمویاب ہوتا ہے بعض اوقات پھول پتیاں بڑی اور ماسّی ہو جاتی ہیں جس طرح کہ سیب کے جیسے پھلوں میں - زیادہ تر بعض خانہ کے غلاف بڑے ہو کر خوردنی حصّہ بناتے ہیں مثلاً تقتفالو اور انگور وغیرہ میں - شہتوت، انناس اور انجیر جیسے پھلوں میں جو مرکّب پھل کہلاتے ہیں پھولوں کے گچھے مختلف طریقوں سے متبدّل ہو جاتے ہیں -

تمام صورتوں میں بیجوں کو متضرّر نہ ہونے کے لئے مختلف ترکیبوں سے محفوظ کیا جاتا ہے - چند مثالوں کے ذریعے اس کو واضح کیا جاتا ہے - انگور کے بیج سخت اور کڑوے ہوتے ہیں - نارنگی جیسے پھلوں کے بیج بہت کڑوے ہوتے ہیں لیکن ان سب میں ایک صاف اور چکنا چھلکا ہوتا ہے جس سے بیج نگلنے میں سہولت ہوتی ہے - جب بیج بڑے اور خوردنی ہوتے ہیں تو وہ یا تو نہایت سخت اور موٹے غلاف میں بند ہوتے ہیں مثلاً قربانی، بیر وغیرہ یا ایک بہت چرمی اور وسیع گودے میں مثلاً سیب وغیرہ - شوخ رنگ کے ایسے خوردنی پھلوں کی حد تک محدود ہونے سے، جن کا کھایا جانا پودوں کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے ثابت ہے کہ یہ بلاشبہ قدرتی انتخاب کا نتیجہ ہے اور یہ زیادہ ظاہر ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ رنگ پھلوں کے پختہ ہونے تک نمودار نہیں ہوتے - یعنی اس وقت تک نہیں جب تک کہ بیج پختہ نہ ہو جائیں - بعض شوخ رنگ رکھنے والے پھل زہریلے ہوتے ہیں لیکن ان میں سے بہت سارے جانوروں کے لئے جو انہیں کھاتے ہیں، مضرت رساں نہیں ہوتے - یا اگر ہوں بھی تو اس میں پودے کا فائدہ ہے -

پھلوں کی نسبت پھول زیادہ اقسام کے رنگوں والے ہوتے ہیں کیونکہ وہ شکل اور ساخت میں زیادہ پیچیدہ اور زیادہ اقسام کے ہوتے ہیں - تاہم ان دونوں امور میں پھل اور پھول کچھ یکسانیت ضرور رکھتے ہیں جس طرح پھولوں میں کیڑوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے توافقات پائے جاتے ہیں اسی طرح پھل پرندوں کو راغب کرتے ہیں - اوّل الذکر صورت میں بار باروری مقصود ہوتی ہے اور آخر الذکر میں انتشار یا پھیلاؤ - جس طرح پھلوں کا خوردنی ہونا ان کے رنگ سے ظاہر ہو جاتا ہے اسی طرح پھولوں کے رنگ بھی کیڑوں

کو شہد یا زیرے کی موجودگی کا پتہ دے دیتے ہیں۔ کیڑوں اور پھولوں کا جو تعلق ہے اس کے متعلق بہت ساری تفصیلات کا انکشاف اسپرنگل ( Sprengel ) نے ۱۷۹۳ء میں کیا تھا۔ بعد میں ڈاروِن نے کیڑوں کے ذریعے پار باروری عمل میں لائی جانے کے فوائد بیان کئے اور سالہا سال کے تجربوں کے بعد ثابت کیا کہ پار باروری سے پودے کی بالیدگی میں سُرعت، اس کی قوّت اور زرخیزی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اصطلاح پار باروری کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اگر کسی پھول کا زیرہ اس کی کلغی پر منتقل ہو تو اس عمل کو خود زیرگی کہتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر خود باروری عمل میں آتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر کسی پھول کا زیرہ اسی پودے کے دوسرے پھول یا اسی نوع کے دوسرے پودے کے پھول کی کلغی پر منتقل ہو تو یہ عمل پار زیرگی کہلاتا ہے جس کے بعد پار باروری عمل میں آتی ہے۔

کیڑوں کے ذریعے باروری عمل میں لانے کے لئے پھولوں کا توافق کیا ہوتا ہے ایک بہت دلچسپ اور اہم سوال ہے۔ اس کا جواب یہاں بہت اختصار کے ساتھ دیا جائیگا۔ مہمان کیڑوں کو دعوت دینے کے لئے پھول کے رنگ، اور اس کی جسامت کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہے کہ زیادہ تر کیڑے خوشنما اور بڑے پھولوں پر جاتے ہیں نہ کہ غیر نمایاں اور چھوٹے پھولوں پر۔ لیکن اس میں کیڑوں کی پسند بھی دخل رکھتی ہے۔ رنگ کی دلفریبی کے ساتھ میٹھی خوشبو سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ اگر پھول کافی بڑے اور خوشنما ہوں تو خوشبو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے زیادہ تر چھوٹے پھولوں میں جسامت کی کمی خوشبو کی مدد سے پوری کی جاتی ہے یا ایسے بڑے پھولوں میں بھی پھولوں کی ضرورت ہوتی ہے جو سایہ میں اُگتے اور لہذا کیڑوں کی نظر میں آسانی سے نہیں پڑ سکتے۔ سفید پھولوں کی زیرگی اور باروری پروانوں کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ رات کی تاریکی میں سفید رنگ بہت دُور سے نظر آجاتا ہے۔ یہ پھول رات ہی میں خوشبو دیتے ہیں۔ اور زیادہ تر رات ہی میں کھلتے ہیں۔ شوخ سُرخ پھولوں کی تتلیاں عاشق ہوتی ہیں جن کے لئے پھولوں میں خاص توافق پایا جاتا ہے۔ نیلے پھول خاص کر شہد کی مکھیوں وغیرہ کو مرغوب ہوتے ہیں اگرچہ وہ دوسرے رنگ کے پھولوں، پر بھی جاتی ہیں۔ مدّھم، زرد یا بادامی رنگ کے پھول مکھیوں کیلئے

دلفریب ہوتے ہیں اور منڈھم ارغوانی پھولوں پر زنبور یا بھڑ کا ہجوم ہوتا ہے۔ بعض پھولوں میں نہ تو خوشبو ہوتی ہے اور نہ شہد ہوتا ہے تاہم وہ اپنے مہمانوں کو جھوٹے یا نقلی شہد دانوں کے ذریعے راغب کرتے ہیں۔ تجربے ہی سے کیڑوں کو پتہ چلتا ہے کہ یہ دھوکا ہے لیکن اس وقت تک پھولوں کا کام نکل چکتا ہے۔ متعدد پھول ایسے ہیں جو بارور ہو جانے کے بعد اپنا رنگ بدل دیتے ہیں تاکہ مہمانوں کو فضول تکلیف نہ دیں اور دوسرے پھولوں کو بارور ہونے کا موقع ملے۔ بہت سارے پھولوں میں مہمان کیڑوں کی رہنمائی کے لئے خاص خاص علامتیں پائی جاتی ہیں جن سے ہر دو کو فائدہ ہوتا ہے۔ بالآخر یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ مختلف پھول مختلف مہمانوں کے لئے خاص توافقات رکھتے ہیں۔ ان کی شکل اور ساخت نیز رنگ اور خوشبو اُن کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ)

پروفیسر محمد سعید الدین
صدر شعبۂ نباتیات جامعۂ عثمانیہ

# افراطِ زر

افراطِ زر کی پالیسی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام کے صرف کو، قیمتوں میں اضافہ کر کے کم کیا جائے۔ مالیاتِ جنگ کے تحت لوگوں کے صرف کو گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ حکومت کو جنگ لڑنے کے لئے کثیر مقدار میں سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومتیں اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کئی طریقے اختیار کرتی ہیں۔ بعض جگہ لوگوں پر نئے نئے محاصل عاید کئے جاتے ہیں یا پُرانے محاصل میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ بعض حکومتیں عوام سے کثیر مقدار میں قرضے لیتی ہیں تاکہ اپنے جنگی اخراجات کی پابجائی کریں اور عوام اپنے صرف میں کمی کریں۔ افراطِ زر کے تحت یہ ہوتا ہے کہ لوگ خرچ تو اتنا ہی کر سکتے ہیں لیکن پہلے کی بہ نسبت زر کے معاوضہ میں اشیاء کی کم مقدار میں حاصل ہوتی ہیں کیونکہ قیمتیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ زر کی مقدار میں زیادتی کا حقیقی مقصد قیمتوں میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ سے ہمیشہ قیمتوں میں اضافہ ہونے لگے۔ اگر کسی ملک میں بے روزگاری ہو اور عاملین پیدائش کی کچھ مقدار بیکار ہو تو زر میں اضافہ کا نتیجہ پیدائش دولت میں اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ایسی صورت میں ملک کی خوشحالی بڑھے گی اور قیمتوں میں بھی زیادہ اضافہ نہ ہوگا۔ یہ صورتِ حال افراطِ زر کی نہیں ہے بلکہ اس کو (                    ) کہتے ہیں۔ اس لئے افراطِ زر سے مراد زر کی مقدار میں ایسا اضافہ ہے جو پیدائش دولت کی رفتار سے زیادہ ہو اور جس کا لازمی نتیجہ قیمتوں میں اضافہ کی شکل میں ظاہر ہو۔

افراطِ زر کی وجہ سے جب قیمتوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے تو عوام اس سے بڑے پریشان ہوتے

ہیں۔ اکثر سربرآوردہ افراد، قومی لیڈروں اور عوامی اداروں کی طرف سے حکومت سے یہ اپیل کی جاتی ہے کہ قیمتوں میں اضافے کو روکا جائے۔ شاید وہ نہیں سمجھتے کہ قیمتوں میں اضافہ کا سبب کیا ہے؟ حکومت قیمتوں میں اضافہ کو زیادہ نہیں روک سکتی کیونکہ ایسا کرنا اپنی حکمت عملی کو آپ نقصان پہنچانا ہے۔ حکومت جنگی قرضے اور محاصل کی پالیسی پر عمل نہ کرے تو وہ یہ کرتی ہے کہ کثیر مقدار میں اپنے خزانوں سے نوٹ جاری کرتی ہے تاکہ اپنے اخراجات کو پورا کر سکے۔ اس قسم کے زرِ کاغذی سے حکومت سپاہیوں کی تنخواہ ادا کرتی ہے، جنگی آلات تیار کرتی ہے اور ذرائع حمل و نقل میں اضافہ کرتی ہے۔ حکومت کو اکثر وہی اشیاء خریدنا پڑتی ہیں جو عام طور پر عوام استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً سپاہیوں کے لئے غلّہ، کپڑا اور پٹرول وغیرہ۔ جنگ کے زمانے میں ان اشیاء کی رسد مقرر اور محدود ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ان کی طلب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قیمتیں بڑھنا شروع ہوتی ہیں اور ان اشیاء کو خریدنے کے لئے حکومت اور عوام میں مقابلہ ہوتا ہے۔ عام لوگوں کی آمدنی چونکہ محدود ہوتی ہے اس لئے وہ قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ اپنے صرف میں کمی کرنے لگتے ہیں لیکن حکومت چونکہ خود نوٹ کرنے کی مجاز ہے اس لئے وہ اپنی ضرورت کے مطابق نوٹس جاری کرتی ہے اور بڑی سے بڑی قیمت پر بھی اشیاء خریدنے تیار رہتی ہے قیمتوں میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے حکومت کے ملازمین، کارخانے کے مزدور اور دوسرے پیشہ ور اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر کرتے ہیں۔ حکومت سے اضافۂ اجرت کا مطالبہ ہوتا ہے۔ حکومتیں اپنے ملازمین وغیرہ کو گرانی الاونس یا وار الاونس دیتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ اور نوٹیں جاری کرتی ہیں جس کا نتیجہ قیمتوں میں مزید اضافہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کہ ان کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے مطمئن ہو جاتے ہیں مگر حقیقت میں ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

زر کی ایک اور قسم ہے یعنی زرِ بنک (چیک جو بنک کی جانب سے جاری ہوتے ہیں)، متمدن ممالک خاص طور پر برطانیہ اور امریکہ میں یہ بہت زیادہ مقبول ہے اور جملہ زر کا ۸۰٪ سے زیادہ حصہ زرِ بنک پر مشتمل ہے۔ اس قسم کے زر میں اضافہ کرنا آسان ہے اور ہر بنک اپنے حدود میں رہ کر ان میں

جتنا چاہے اضافہ کرسکتا ہے اور اس سے قیمتوں میں اور زیادہ اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ہندوستان میں زرِ بنک کو ابھی وہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی ہے اور وہ سوائے چند بڑے بڑے شہروں کے کہیں نہیں چلتا۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں اکثر ملکوں مثلاً جرمنی، فرانس اور انگلستان وغیرہ میں افراطِ زر کی پالیسی پر عمل کیا گیا تھا اور اس سے چند ممالک کو بڑا نقصان پہنچا جیسے جرمنی۔ مگر اس دفعہ یہہ تمام ممالک بڑی احتیاط برت رہے ہیں۔ اور گزشتہ تجربوں کو کام میں لا رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں افراطِ زر کی رفتار بہت تیز ہے اور قیمتوں میں اضافہ کی رفتار مذکورہ بالا تمام ممالک سے زیادہ ہے۔

عام طور پر افراطِ زر کی پالیسی کی مخالفت کی جاتی ہے اور اس کے مضر اثرات کو روکنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کئے جاتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس طریقہ میں کیا برائیاں ہیں۔

افراطِ زر کی پالیسی کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس کی وجہ سے امیروں پر کم اور غریبوں پر زیادہ بار پڑتا ہے۔ مثلاً اگر قیمتوں میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوجائے تو ان دونوں طبقوں کے خرچ میں ۲۰ فیصد کی زیادتی ہوگی۔ حالانکہ امیروں کی استطاعت اور صلاحیت غریبوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ اصول کہ قیمتوں میں اضافہ کا بار امیروں پر کم اور غریبوں پر زیادہ پڑے ترقی پسند نظام محاصل کے بالکل خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل کرنے والوں پر خواہ ان کی آمدنی ایک ہی کیوں نہ ہو، یکساں اثر نہیں پڑتا۔ ایک ایسا شخص جس کی آمدنی کا ذریعہ تمسکات پر مقررہ مقدار میں سود پانا یا وظیفۂ پیری ہے بہت زیادہ زیر بار ہوتا ہے کیونکہ قیمتوں میں تو اضافہ ہوتا ہے لیکن اس کی آمدنی اتنی ہی رہتی ہے۔ کارخانے کے مزدور جو قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے اپنی اجرتوں میں اضافہ کروا لیتے ہیں وہ کم زیر بار ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے کمیشن ایجنٹ جن کو قیمت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ زیادہ شرح سے کمیشن ملتا ہے فائدہ میں رہتے ہیں یہی حال تاجروں اور آجروں کا ہے ــــ تیسرے یہ کہ افراطِ زر اپنے مقصد کے حصول کا کوئی اچھا یا مناسب طریقہ نہیں ہے۔ اس پالیسی کا مقصد عوام کے صرف کو کم کرنا ہے مگر بعض لوگوں کی آمدنی میں اس کی وجہ بہت زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ بہت زیادہ صرف کرسکتے ہیں جیسے

تاجر، محتکر یا سٹہ باز اور کارخانہ دار۔ یہ لوگ اکثر آئندہ قیمتوں میں جو اضافہ ہونے والا ہوتا ہے اس کا اندازہ لگا کر سامان ذخیرہ کرنا شروع کرتے ہیں اور اس کو اس وقت فروخت کرتے ہیں جبکہ قیمتیں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں اس طرح دوسروں کی مصیبتوں سے فائدہ اٹھا کر بہت ہی خوش حال ہو جاتے ہیں۔

افراطِ زر کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اکثر معاشرہ میں پریشان حالی پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ شورش اور بغاوت کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ جب قیمتیں چڑھنے لگتی ہیں تو مزدور اضافۂ اجرت کی جد وجہد شروع کرتے ہیں۔ وہ ہڑتالیں کرتے اور شور مچاتے ہیں۔ جب قیمتوں کا اضافہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو سب لوگ بڑے پریشان ہوتے ہیں اور جب ان کو غذا، لباس وغیرہ جیسی ضروریات زندگی کی اشیاء میسر نہیں ہوتیں تو وہ اکثر لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں انگلستان میں قیمتوں میں ۸۰ فیصد کا اضافہ ہوا تھا۔ فرانس میں قیمتیں پانچ گنا زیادہ ہوگئی تھیں اور جرمنی میں تو قیمتوں کی زیادتی نے ایسی بربادی کا منظر پیش کیا کہ دنیا نے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ سب سے زیادہ متوسط طبقہ تباہ ہوا اور اسی کی ہلچل نے نازی تحریک کی شکل اختیار کی۔

اُس دفعہ ہندوستان میں قیمتیں کچھ زیادہ نہیں بڑھی تھیں مگر اس دفعہ ان میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں افراطِ زر کی کیا حالت ہے۔ ایک زمانے تک تو اس حقیقت سے ہی انکار کیا جاتا رہا کہ یہاں افراطِ زر کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مگر اب تو سب جانتے ہیں کہ واقعی یہاں بھی یہ پالیسی اختیار کی گئی ہے۔

ہمارے ملک میں پچھلی جنگِ عظیم سے زرِ کاغذی کے استعمال میں بہت زیادہ اضافہ ہو رہا ہے اور آجکل تو نوٹوں کی مقدار مجموعی زر کی مقدار کا کوئی ۸۰ فیصد ہے۔ موجودہ جنگ کے آغاز سے حکومت نوٹوں میں برابر اضافہ کرتی رہی ہے کیونکہ اس نے شروع سے ملک کے مالیہ کو جنگی مالیہ بنا لیا تھا۔ ہم ذیل میں جنگ کے بعد سے نوٹوں کی تعداد میں اضافہ کو ظاہر کرتے ہیں۔

ڈسمبر ۱۹۳۹ء، ڈسمبر ۱۹۴۰ء، ڈسمبر ۱۹۴۱ء، ڈسمبر ۱۹۴۲ء، اپریل ۱۹۴۳ء میں علی الترتیب ۲۳۴

کروڑ روپیے، ۳۴۲ کروڑ روپیے، ۴۱۴ کروڑ روپیے، ۵۰۷ کروڑ روپیے، ۶۹۰ کروڑ روپیے کے نوٹ جاری کیے گئے مذکورۂ بالا اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ نوٹوں کی تعداد میں ۱۹۳۹ء کے بعد سے اپریل ۱۹۴۳ء تک تقریباً ۳۰۰٪ کا اضافہ ہو چکا ہے۔ ہر روز ایک کروڑ روپیے کے نوٹ ریزرو بنک کی طرف سے جاری کیے جارہے ہیں۔ افراط زر کی تعریف یہہ ہے کہ نوٹوں میں ایسا اضافہ کیا جائے جو پیدائش دولت میں اضافہ کے مقابلے میں زیادہ ہو۔ اب ہم کو یہہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے ملک میں پیدائش دولت کے اضافہ کا کیا حال ہے۔ ملک کا سب سے اہم پیشہ جس میں ۷۰٪ آبادی لگی ہوئی ہے، زراعت ہے۔ یہ ایسا پیشہ ہے کہ جس میں پیداوار کا بڑھانا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ پہلے تو یہہ زیادہ تر قدرتی اسباب پر منحصر ہے۔ دوسرے اس میں اضافہ کے دوسرے طریقے بھی مشکل ہیں۔ ذرائع آبپاشی میں فوری اضافہ ممکن نہیں اور نہ بنجر اور ناقابل کاشت زمینوں کو استعمال کیا جاسکتا ہے " زیادہ غلہ اگاؤ" کی مہم کے تحت ایک طرف اگر کچھ پیداوار میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف تجارتی فصلوں کی مقداریں بہت زیادہ کمی ہو گئی ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ بحیثیت مجموعی زرعی پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا ہے صنعتی پیداواروں کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اضافے کا بھی زیادہ امکان نہیں ہے کیونکہ مشنری کی بہت زیادہ کمی ہے اور اس کی برآمد بند ہو گئی ہے۔ قوت محرکہ میں بھی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ اور کوئلہ وغیرہ بھی وافر مقدار میں موجود نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوہے اور فولاد، پارچہ بافی، کاغذ سازی وغیرہ کی صنعتوں میں تھوڑی بہت ترقی ضرور ہوئی ہے مگر یہ زیادہ قابل لحاظ نہیں اور اس میں آئندہ اضافے کے کچھ بھی امکانات نہیں ہیں۔

جب زر کی مقدار میں اضافے کے ساتھ ساتھ پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا تو قیمتیں بڑھنے لگیں جن کو ہم اشاری اعداد یا ( Dismal figures ) کے ذریعے ظاہر کرسکتے ہیں۔ ذیل میں ہم کلکتہ کے اشاری اعداد دیتے ہیں:-

مذکورۂ بالا جدول سے قیمتوں کے اضافہ کی رفتار معلوم ہو سکتی ہے۔ گزشتہ چھ ماہ میں تو قیمتوں کا اضافہ اور زیادہ تیز ہو گیا ہے۔ اور آجکل قیمتیں جنگ سے پہلے کی قیمتوں سے ۳، ۴ گنی زیادہ ہیں۔ ان کی تباہ کاریوں کی مثال بنگال اور ملایا میں اچھی طرح مل رہی ہے۔

اس سے پہلے ہم نے افراط زر کی خرابیوں پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح اس کا اثر مختلف طبقات پر مختلف نوعیت کا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ جس طبقہ نے اس سے فائدہ اٹھایا محض، تاجر اور کارخانہ دار تھے۔ اور خاص طور پر ایسے ذخیرہ اندوز تھے جنہوں نے جنگ کے آغاز ہی سے اشیاء کا ذخیرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ ان کو بڑھی ہوئی قیمتوں پر فروخت کر کے خوب نفع کمائیں۔ جہاں تک زراعت پیشہ طبقہ کا تعلق ہے اس کو زیادہ فائدہ یوں نہیں ہوا کہ اُس طبقہ میں ایک بڑی تعداد زرعی مزدوروں، خود کاشت چھوٹے چھوٹے کسانوں کی ہے۔ گو زمینداروں کو پیداوار کی قیمتوں میں اضافے سے کچھ فائدہ ضرور ہوا ہے مگر بہ حیثیت مجموعی اس طبقے پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا۔ اگرچہ مزدوروں نے اپنی سبھاؤں کی مدد سے گرانی الونس یا وار الونس جاری کروا لیا ہے مگر قیمتوں کے اضافے کے مقابلے میں اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ سب سے زیادہ جس طبقے کو اس حکمت عملی سے نقصان پہنچا وہ مقررہ آمدنی پانے والا طبقہ مثلاً ملازمین، وظیفہ یاب وغیرہ ہیں۔ ان کی آمدنی تو اتنی ہی ہے مگر روپیے کی قدر میں ۳، ۴ گنی زیادہ کمی ہو گئی ہے۔

مختصر یہ کہ افراطِ زر کی پالیسی سے ملک کو بحیثیتِ مجموعی بڑا نقصان پہنچا ہے اور اگر آئندہ احتیاط نہ برتی گئی تو اور زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سیّد عابد حسین رضوی
متعلم سالِ چہارم (معاشیات)

# پروفیسر محمد جمیل الرحمن

محمد جمیل الرحمن ۱۳ اکتوبر ۱۸۹۰ء مطابق ۱۸ صفر ۱۳۰۸ھ کو ملک اودھ (صوبہ متحدہ) کے مقام پرتاب گڑھ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے نانا مولوی حسام الدین احمد[1] صاحب اس زمانے میں تحصیلدار تھے۔ ان کا اصلی وطن صوبہ متحدہ کے ضلع میرٹھ کا قصبہ سرادہ[2] تھا۔ آپ اس قصبہ کے ایک نہایت معزز اور سربرآوردہ خاندان

---

۱۔ یہ بزرگ بھی صاحب تصانیف ہیں۔ ان کی بڑی تصنیف "انوار العیون" ہے جو نقشبندی خانوادے کے اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ سیرت نبوی کے متعلق دو نہایت مفید رسالے "مائدہ محمدیہ" اور "لباس المحبوب" کافی مقبول ہوئے، جن میں بالترتیب جناب نبی کریم کے طعام و لباس سے بحث کی گئی ہے۔ مولوی صاحب موصوف ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹری سے وظیفہ یاب ہوئے۔ اور ۱۹۲۶ء میں اپنے وطن میں انتقال فرمایا۔ ۲۔ سرادہ شہر میرٹھ سے بارہ میل کے فاصلے پر ہاپوڑ کی تحصیل میں واقع ہے۔ قریب ترین ریلوے اسٹیشن بھی وہاں سے دو میل پر ہے۔ یہ وہی مقام ہے جو نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب سابق سکرٹری ایم، اے، او کالج علی گڑھ) کی بھی جنم بھومی ہے۔ یہ قصبہ ایک زمانے میں راجہ ٹوڈرمل کا (جو مہابلی مہاراج حضرت جلال الدین اکبر شاہنشاہِ ہند کے نورتن میں سے تھے) بھی وطن رہ چکا ہے، چنانچہ اُن کی گڑھی کے آثار اب بھی وہاں موجود ہیں۔ قصبہ کی آبادی کے باہر بیس بائیس برس سے سرکار ہند کے محکمہ آثار قدیمہ نے حفاظت اور نگرانی کے لئے دو مقامات پر نشانات لگا کر اطلاعی اور امتناعی اشتہار لگا رکھے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ ان مقاموں پر نہایت قدیم زمانے کے کچھ آثار نکلیں گے۔ معلوم نہیں کیا امور مانع ہوئے کہ اب تک اُن کی کھدائی شروع نہیں کیگئی۔ ان کے برآمد ہونے پر یہ قصبہ بھی ایک اہمیت کا مالک اور مرجع خلائق ہو جائے گا۔

"قانون گویان" کے ایک فرد تھے۔ "قانون گوئی" جو زمانۂ مغلیہ سے ان کے بزرگوں میں موروثی عہدے اور حیثیت کے طور پر چلی آتی تھی اور اس قیامتِ صغریٰ کے بعد جسے ستم ظریف ۱۸۵۷ء کا غدر کہتے ہیں، ان کے پرداداشیخ خواجہ احمد صاحب پر ختم ہوئی، غالباً وہی حیثیت رکھتی تھی جو آجکل ایک ضلع کے کلکٹر یا ریونیو بورڈ کے رکن کی ہوتی ہے۔

جمیل الرحمٰن صاحب کی تعلیم تمامتر لاہور میں ہوئی جہاں اُن کے والدِ ماجد مولوی محمد خلیل الرحمٰن[۱] صاحب مرحوم بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ گو تعلیم کا آغاز کسی باقاعدہ "بسم اللہ" یا مکتب نشینی کی رسم سے نہیں ہوا، جو عموماً شرفا کے یہاں کے چار برس چار مہینے کی عمر میں برپا ہوا کرتی ہے، مگر پانچواں ہی سال تھا کہ ان کی والدۂ ماجدہ نے ان کو قاعدہ پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ابھی یہ بغدادی قاعدہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ قرآن شریف کی تعلیم حسبِ دستور پارۂ عما یتسا لون سے شروع ہو گئی۔ ایک پارۂ قرآن ختم ہونے پر ایک طرف تو ایک حافظ صاحب کی نگرانی میں قرآن کی تعلیم جاری رہی، دوسری طرف خود ان کے والدِ ماجد نے اُردو پڑھانا شروع کر دیا، پھر حساب اور فارسی زبان کی تعلیم بھی شروع ہو گئی۔ فارسی کے ابتدائی رسالے ختم کر کے وہ گلستانِ سعدی اور پندنامہ فریدالدین عطار تک پہنچے تھے کہ ۱۹۰۰ء میں لاہور کے اچیسن ہائی اسکول میں درجۂ چہارم میں داخل کر دیے گئے۔ جب یہ اسکول ۱۹۰۳ء میں ٹوٹ کر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تو اُن کو اسلامیہ ہائی اسکول کی ابتدائی جماعتوں کی ایک شاخ (واقع چینگڑ محلہ) میں درجۂ پنجم میں داخل کر دیا گیا۔ یوں ان کی ابتدائی عمر کے دو سال ضائع ہو گئے ۱۹۰۵ء میں اسلامیہ ہائی اسکول (واقع شیراں والا دروازہ) کی چھٹی جماعت میں پہنچ گئے اور اسی اسکول سے ۱۹۰۹ء میں میٹرکولیشن پاس کیا۔ اسی سال یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے وہ لاہور کے فورمن کرسچین کالج کی انٹرمیڈیٹ

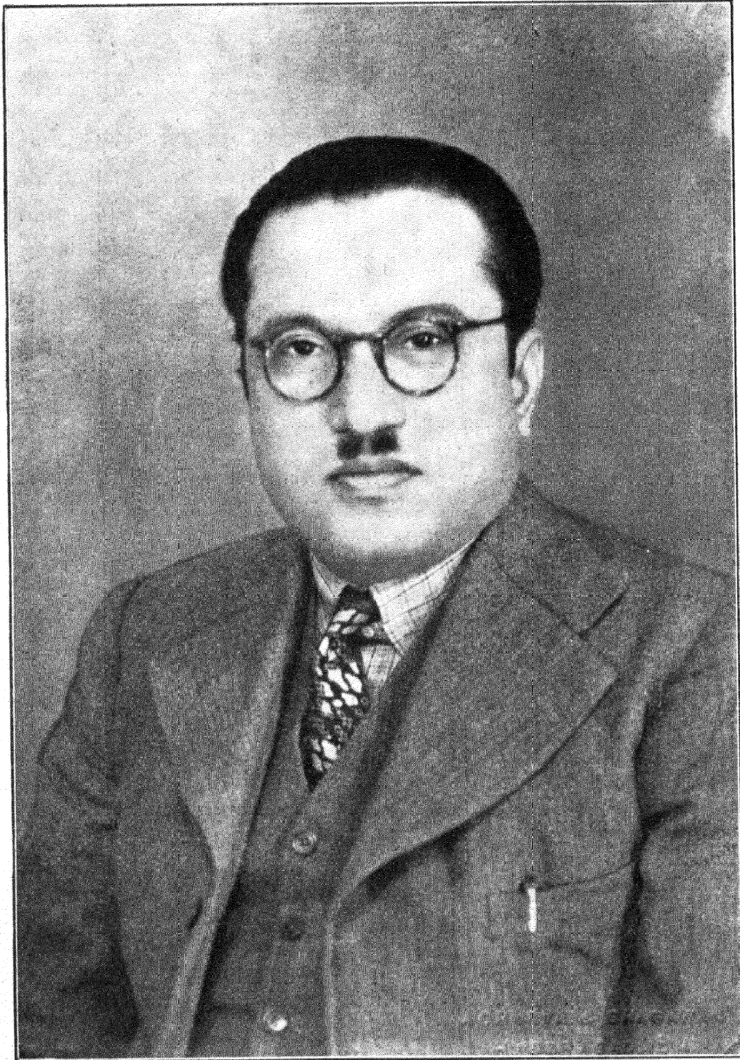
---

۱۔ مولوی صاحب نے ۱۹۳۹ء کے آغاز میں الہ آباد میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہیں۔ آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ جن میں زرنشت نامہ، تاریخ الخلفا، نفح الطیب، اخبار الاندلس اور عذرا نہایت مشہور رہیں۔ حق یہ ہے کہ آپ کے حالات ایک مستقل تالیف کے خواستگار ہیں۔

(آرٹ) میں داخل ہوئے۔ اور اسی کالج سے ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری لی۔ پھر ۱۹۱۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کی تکمیل کی جس پر ان کی درسگاہی تعلیم کا خاتمہ ہوگیا۔

یہہ تو ان کی مدرسی تعلیم کی مختصر تاریخ ہے۔ لیکن ان کو تاریخ عالم (اور بالخصوص تاریخ اسلامی) اور سوانح و سیاحت کی کتابوں کے مطالعے سے جو شغف تھا اسے اس تعلیم سے عجیب طور پر مدد ملی۔ یہہ کہاوت کہ "ماں کی گود سب سے پہلا مدرسہ ہے" ان کے حالات پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ ان کی والدۂ ماجدہ نے (جو بحمداللہ ابتک بقید حیات اور اپنے فرزند اکبر کے لئے بے حد سوگوار ہیں) ایک طرف تو انھیں الف با کا درس دیا اور ارکان دینی کی ابتدائی تعلیم دینا شروع کی۔ دوسری طرف وہ دن رات کے فرصت کے اوقات کو ان کے ساتھ یوں صرف کرتی تھیں کہ انہیں انبیائے کرام کے حالات اور بالخصوص حضرت رسول کریم صلعم کی سیرت کریمہ سنایا کرتی تھیں۔ یہہ تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی تھی۔ اور کم تر کتابی۔ مادر مشفقہ کی زبان سے صاف و سادہ الفاظ میں کہانیوں کے رنگ میں یہہ تمام روایتی اور تاریخی حالات اس قدر دلچسپ ہوتے تھے کہ اس ننھے متعلم کو شب کی آمد کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے اہم فرض سے فارغ ہوکر یہہ معصوم اپنی ماں کی گود میں لیٹ کر یہہ کہانیاں سنتا سنتا سو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس "تعلیم گوش" نے کتابی وسیلہ اختیار کرلیا، اور "کہانی" کے سلسلے میں پہلے قرآن کریم کی سورۂ یوسف کی منظوم تفسیر، پھر الواقدی کی منظوم فتوح الشام کے چیدہ چیدہ مقامات (خصوصاً وہ حصے جن میں جنگ کے نظارے اور بہادروں کے کارنامے مذکور تھے) اس کے بعد فردوسی کے شاہ نامے کا منظوم ترجمہ اور اس کی تصاویر، پھر متفرق کتابوں سے بزرگان اسلام کے حالات اور سوانحعمری، ان سب کا ایک نہایت دل آویز اور لا متناہی سلسلہ تھا کہ روزانہ شب کو جاری رہتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ یہہ کہانیاں جامعہ عثمانیہ کے لیے تاریخ اسلام کے ایک فاضل استاد کے دل و دماغ کی آفرینش اور پرورش کر رہی ہیں۔

اتفاقات بھی کچھ عجیب طرح سے جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب پروفیسر مرحوم کے والد ماجد حیدرآباد دکن (صانہا اللہ عن الفتن) کے رسالہ حسن میں تاریخ اسلامی، اور خصوصاً تاریخ اندلس کے مختلف و متفرق ابواب پر مضامین نویسی کرکے نام اور انعام پا رہے تھے۔ جب وہ اسکول میں داخل ہوئے تو تیسری اور چوتھی جماعت کی



**پروفیسر محمد سعید الدین صاحب**

بی - ایس سی ، ایم - اے ، ( اڈنبرا ) ایف - آر - ایم - ایس - ایف - ایل - سی

خازن اعزازی مجلہ عثمانیہ



پروفیسر جمیل الرحمن مرحوم

اُردو کتابوں میں محمود غزنوی، سبکتگین، علاؤالدین، شہاب الدین محمد غوری کے حالات اور ایک درسی کتاب قصص ہند کی مندرجہ تاریخ ہند کی روایات اور بزرگانِ ہند کے حالات نے ان میں علم رجال و تاریخ کا شوق اور بھی بڑھا دیا۔ اسکول میں تو درسی کتب یوں یہ شوق پیدا کر رہی تھیں۔ اُدھر گھر پر اُن کے والدِ ماجد نے تاریخیات کا سلسلہ کہانیوں کی صورت میں جاری رکھا، اور چونکہ وہ خود بھی تاریخ و سیاحت کے فنون سے حد درجہ شغف رکھتے تھے، اس لئے جو انگریزی کتابیں خود ان کے مطالعے میں رہتی تھیں اُن کی دلکش تصویریں اس ننھے سے مؤرخ کی نگاہوں کے لئے اور بھی جاذب تھیں۔ چنانچہ لاہور کے کتب خانۂ عام سے جس قدر کتابیں گھر میں آتی تھیں ان کی تمام تصویریں اور اُن تصویروں کے مضامین و مقاصد اس شوقین لڑکے کے تمام غیر مصروف وقت کے لئے مصروفیت اور اس کے دماغ و دل کے لئے تربیت تعلیم اور تفریح کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔

ان کو اسلامیہ اسکول میں داخل کرانے میں پروفیسر مرحوم کے والد کی جو غرض مضمر تھی وہ بھی بوجہ احسن پوری ہوئی۔ اس اسکول کی سات برس کی تعلیم نے اُن میں اسلام اور اسلامیات کی طرف وہ رجحان پیدا کر دیا جس نے بعد میں انہیں تاریخ اسلام کے لئے وقف کر دیا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران میں انہوں نے کبھی خاص طور پر اپنے درس میں انہماک اور محنت سے کام نہیں لیا، جو عموماً ایک ذہین طالب علم کا شیوہ ہوتا ہے۔ انہیں کبھی اس کی پروا نہیں ہوئی کہ وہ اپنی جماعت میں کوئی ممتاز حیثیت یا درجہ حاصل کریں۔ وہ درسی مضامین اور کتب کا صرف اتنا مطالعہ کرتے تھے کہ محض "کامیابی" حاصل ہو جائے اور اس مختصر مطالعے کے بعد جو کچھ اور جتنا کچھ وقت اُن کو ملتا تھا وہ سب کا سب تاریخ عالم خصوصاً تاریخ اسلام کے مطالعے پر صرف کرتے تھے۔ ان کی اس عجیب اور "طالب علم کے لئے خطرناک" عادت سے کبھی کبھی خود ان کے والدین بھی ان کو اس روش سے ہٹانے اور باز رکھنے اور درسی کتب کے مطالعے کی طرف رغبت دلانے کی کوشش کرتے تھے، مگر وہ اپنی اس روش سے کبھی باز نہ آئے اور اُن کی یہ بُری عادت "بی اے پاس کرنے تک برابر جاری رہی۔ انتہا ہے کہ انہیں اس "نقصان دہ" عادت کے سبب سے دو بار انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ناکامیابی کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ مگر رُوما، یونان، انگلستان یورپ اور ہندوستان کی تاریخوں پر بھی (جو ان کے امتحان کے نصاب میں شامل تھیں)، وہ تاریخ اسلام کے بجی

پیدا کردی، اور خیالات میں ایک صحیح نوع کی ترمیم و تنسیخ کر کے وہ نظم پیدا کر دیا جس پر ان کی زندگی بھر کے مطالعے اور علم نوازی کا دار و مدار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کے فیض سے انہوں نے جرمانی زبان کا مطالعہ بھی شروع کیا تھا۔ جسے بعد میں اور بڑھا کر انہوں نے اپنے مطالعات اور تصنیفات میں کافی استفادہ کیا۔ یہ صحبت انہیں تقریباً دو برس تک مسلسل اور اس کے بعد دو برس تک وقفوں کے ساتھ حاصل رہی۔ وہ اپنی تمام تعلیم کے زمانے میں ان دو تین برسوں کو بہترین زمانہ شمار کرتے تھے۔ آخری وقت تک اپنے تمام اساتذہ میں ڈاکٹر صاحب ممدوح کو بالکل ممتاز خیال کرتے تھے اور انہیں خاص ادب و احترام کے جذبات کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے یہ جذبات بالکل صحیح اور بجا تھے۔

ایم اے پر مدرسی تعلیم ختم کرنے کے آٹھ مہینے بعد، نومبر ۱۹۱۶ء میں جمیل الرحمٰن صاحب کو مہاراجہ گائکواڑ کی ریاست بڑودہ میں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کی جماعت میں ایک فاضل کی حیثیت سے بازجست کرنے کی ملازمت حاصل ہو گئی۔ اس جماعت کے سرکردہ اور ناظم پروفیسر وجری تھے، جو فلسفہ اور مذہبیات کے عالم اور ایک فلسفی جریدے کے مدیر بھی تھے۔ اس علمی جماعت میں کئی جوان سال و جوان ہمت عالم شریک تھے، جو اپنے اپنے دین و مذہب کے تقابلی مطالعے میں مصروف تھے۔ اس میں پروفیسر جمیل الرحمٰن مرحوم کو صرف ایک برس رہنے کا اتفاق ہوا۔ اُن کے مطالعے کا نتیجہ ان کی انگریزی کتاب ابن رشد اور اس کا فلسفہ ہے۔ جو حکومت کی نگرانی اور سرپرستی میں بڑودہ ہی سے شائع ہوئی تھی۔

۱۹۱۷ء کے اواخر میں مملکتِ حیدرآباد دکن کے دارالعلوم عربیہ سرکار عالی کے لئے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہوئی جو بیک وقت تاریخ اور عربیات کا ماہر ہو اور دارالعلوم میں تاریخ اسلامی کا درس دے سکے۔ جوان عمر جمیل الرحمٰن کی خوش نصیبی تھی کہ اسے دارالعلوم میں یہ خدمت حاصل ہو گئی اور دارالعلوم کی خوش بختی تھی کہ اُسے ایسا فاضل مل گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ اپنے پرنسپل مولانا حمیدالدین صاحب (المعروف بہ عبدالحمید فراہی) کی نظر میں منظور، اپنے رفقائے کار میں ہر دل عزیز اور اپنے شاگردوں میں محبوب ہو گئے۔ مگر دارالعلوم میں اس خدمت کو انجام دیتے ہوئے ایک ہی برس ہوا تھا کہ (۱۹۱۸ء میں) حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ

مطالعے کو برابر ترجیح ہی دیتے رہے

ان کا انٹرمیڈیٹ اور بی اے کا زمانہ تعلیم لاہور کے فورمن کرسچین کالج میں گزرا۔ اس مسیحی مشن کے کالج کی تعلیم سے انہوں نے بڑا فائدہ یہ اٹھایا، اور وہ ہمیشہ اس کے معترف رہے، کہ ان کو اس دوران میں اسلام اور مسیحیت کے تقابلی مطالعے کا موقع مل گیا۔ اس چھ سال کے عرصے میں انہیں انجیل و توراۃ کے روزانہ درس سے ایک طرف قرآن کو نصاریٰ اور ارباب نصرانیت کے شمائل و اخلاق سے بتثبت اور براہِ راست آگاہی ہو گئی، دوسری طرف اس نے ان کو تاریخِ اسلام کے ان تمام موقعوں کے غائر مطالعے کی طرف متوجہ کر دیا جہاں اہل اسلام اور نصرانیت میں تصادم ہوا۔ چنانچہ وہ بی اے پاس کرنے تک روما، بازنطین، شام و فلسطین، یونان، افریقہ، اندلس اور حروب صلیبی کی تواریخ کے تمام ایسے مواقع سے بخوبی واقف ہو چکے تھے جہاں یہ محاورۂ عامہ "صلیب و ہلال میں آویزش رہی اور اس تمام مطالعے سے ان پر مسیحیت اور اس کے ارباب کی جہالت، بربریت اور اُن کا مکر و دجل پوری طرح واضح ہو گیا۔

انہوں نے ایم اے کی ڈگری کے لئے عربی زبان و ادب کا مطالعہ اختیار کیا، جسے وہ بی اے کے دوران میں تاریخ اور اقتصادیات اختیار کر کے ترک کر چکے تھے۔ گو ان کا نجی مطالعہ اس وقت بھی جاری رہا۔ ایم اے کی تعلیم سے ان کو بیک وقت عربیات اور اسلامیات کے مطالعے کا موقع مل گیا۔ اسی زمانے میں ان کو ایک ایسے استاد سے سابقہ پڑا جس کی شخصیت اور تعلیم و تلقین کا اُن پر اور اُن کے ذہن پر بہت گہرا اثر ہوا۔ یہ شخصیت پروفیسر ڈاکٹر عظیم الدین احمد[1] صاحب کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی صحبت نے اُن میں قرآنِ عظیم، حدیثِ نبوی، سیرت نبوی، سیرِ صحابۂ کرام، تاریخِ اسلام، عرب کے تمدن و تہذیب، غرض کہ اسلام اور اہل اسلام کی تاریخ، سیاست اور ثقافت، اور علوم عربیہ، میں ان کی نگاہ میں اس قدر وسعت

---

[1] یہ بزرگ چار پانچ برس ہوئے کہ اپنے وطن (پٹنہ) کی یونیورسٹی سے وظیفہ یاب ہوئے ہیں جہاں وہ عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔

پیدا کردی، اور خیالات میں ایک صحیح نوع کی ترمیم و تنسیخ کرکے وہ نظم پیدا کردیا جس پر ان کی زندگی بھر کے مطالعے اور علم نوازی کا دار و مدار ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کے فیض سے انہوں نے جرمانی زبان کا مطالعہ بھی شروع کیا تھا۔ جسے بعد میں اور بڑھا کر انہوں نے اپنے مطالعات اور تصنیفات میں کافی استفادہ کیا۔ یہ صحبت انہیں تقریباً دو برس تک مسلسل اور اس کے بعد دو برس تک وقفوں کے ساتھ حاصل رہی۔ وہ اپنی تمام تعلیم کے زمانے میں ان دو تین برسوں کو بہترین زمانہ شمار کرتے تھے۔ آخری وقت تک اپنے تمام اساتذہ میں ڈاکٹر صاحب ممدوح کو بالکل ممتاز خیال کرتے تھے اور انہیں خاص ادب و احترام کے جذبات کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے یہ جذبات بالکل صحیح اور بجا تھے۔

ایم اے پر مدرسی تعلیم ختم کرنے کے آٹھ مہینے بعد، نومبر ۱۹۱۶ء میں جمیل الرحمٰن صاحب کو مہاراجہ گائکواڑ کی ریاست بڑودہ میں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کی جماعت میں ایک فاضل کی حیثیت سے بازجست کرنے کی ملازمت حاصل ہوگئی۔ اس جماعت کے سرکردہ اور ناظم پروفیسر وجری تھے، جو فلسفہ اور مذہبیات کے عالم اور ایک فلسفی جریدے کے مدیر بھی تھے۔ اس علمی جماعت میں کئی جوان سال و جوان ہمت عالم شریک تھے، جو اپنے دین و مذہب کے تقابلی مطالعے میں مصروف تھے۔ اس میں پروفیسر جمیل الرحمٰن مرحوم کو صرف ایک برس رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے مطالعے کا نتیجہ ان کی انگریزی کتاب ابن رشد اور اس کا فلسفہ ہے جو حکومت کی نگرانی اور سرپرستی میں بڑودہ ہی سے شائع ہوئی تھی۔

۱۹۱۷ء کے اواخر میں مملکت حیدرآباد دکن کے دار العلوم عربیہ سرکار عالی کے لئے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہوئی جو بیک وقت تاریخ اور عربیات کا ماہر ہو اور دارالعلوم میں تاریخ اسلامی کا درس دے سکے۔ جوان عمر جمیل الرحمٰن کی خوش نصیبی تھی کہ اسے دار العلوم میں یہ خدمت حاصل ہوگئی اور دار العلوم کی خوش بختی تھی کہ اسے ایسا فاضل مل گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ اپنے پرنسپل مولانا حمید الدین صاحب (المعروف بہ عبد الحمید فراہی) کی نظر میں منظور، اپنے رفقائے کار میں ہر دل عزیز اور اپنے شاگردوں میں محبوب ہوگئے۔ مگر دار العلوم میں اس خدمت کو انجام دیتے ہوئے ایک ہی برس ہوا تھا کہ (۱۹۱۸ء میں) حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ،

کی سرکار عالی سے جامعۂ عثمانیہ کے قیام کا فرمان صادر ہوا اور دارالعلوم اس جدید جامعہ میں مدغم اور اس کے طلبہ اس کی جماعتوں میں جذب ہو گئے۔ اسی سلسلے میں پروفیسر جمیل الرحمن بھی اور اساتذہ کے ہمراہ جامعہ میں منتقل ہو کر شعبۂ تاریخ کے ایک موقر و ممتاز رکن ہو گئے۔ اس جدید حیثیت میں انہیں اپنے فاضل و فائق دوست پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کی رفاقت کا اتفاق ہوا۔ اور ان صاحبین کی مشاورت سے جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ تاریخ اور اس کے مختلف فروع کی تنظیم و تشکیل عمل میں آئی۔ پروفیسر شروانی ہمیشہ اپنے اس فاضل رفیق کار کی فضیلت، ان کی بلند ذہنیت اور رائے صائب کے قائل اور قدر دان رہے اور اب بھی نہایت لطف و محبت کے جذبات سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جمیل الرحمن سا قابل رفیق کار، ایسا سچا دوست اور ایسا صادق النیت مشاور انہیں میسّر نہ ہو گا۔

پروفیسر صاحب کی باقی تمام عمر جامعۂ عثمانیہ ہی میں علم کی خدمت اور ارباب علم کی صحبت میں بسر ہوئی۔ جیسے جیسے جامعہ نے انٹرمیڈیٹ سے بی۔اے، ایم۔اے اور مافوق درجوں تک ترقی کی ویسے ویسے ان کی تدریس اور مختلف و متفرق مدارج کے طلبہ کی رہنمائی میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ جس دیانت داری، جاں فشانی اور فرض شناسی کے ساتھ انہوں نے شعبۂ تاریخ اسلام میں اپنے فرائض منصبی انجام دیئے، وہ اس شعبہ کے ارتقاء اور وسعت سے ثابت ہے۔ اپنے عزیز طلبہ کی جس ہمدردی، دل سوزی، شفقت اور توجہ سے انہوں نے راہنمائی اور راہبری کی اور ان کے دماغ و ذہن کو جس بلند پائے تک پہنچا دیا، ان کے مستند و قابل و فاضل شاگردوں کی مابعد جامعہ زندگی اور ان میں سے اکثر کے فاضلانہ مشاغل اس پر شاہد عادل ہیں۔ خاص تدریسی شغلوں کے علاوہ انہوں نے اپنے اوقاتِ عزیز کو جس نہج پر صرف کیا اور مصروف رکھا اس کی صرف دو ہی صورتیں تھیں۔ اپنے شاگردوں کو تاریخی مضامین اور مواد کی بازجست اور تحقیق میں امداد اور راہنمائی، اور ان مضامین پر خود خامہ فرسائی اور ان کے قدردانوں کی بصیرت افروزی۔ اس میں بھی انہوں نے جس حسن عمل اور صحت فکر و رائے سے کام لیا وہ ان کے کثیر مضامین اور ان کتابوں سے عیاں ہے، جو ان کے قلم کی تالیف، تصنیف یا ترجمہ کی ہوئی ہیں اور جو ان کے نام کو دنیائے علم و ادب میں ایک طویل عرصے تک زندہ رکھیں گی۔

پروفیسر جمیل الرحمن کی شادی اور کتخدائی ان کے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء میں اُن کی عین چھبیس سال کی عمر میں دہلی کے ایک شریف و نجیب خاندان میں مولوی عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تقدیر الہٰی کی خوبی سے ان کو بی بی ایسی ملیں جو ہر لحاظ سے ان کے افکار و مشاغل میں موید اور ان کی صحیح مزاج داں طبیعت شناس اور اُمور خانہ داری میں ان کو بے فکر رکھنے والی ثابت ہوئیں۔ بیگم جمیل الرحمن اپنے عزیز شوہر کی طرح ایک دردمند دل رکھتی ہیں اور وسیع اخلاق کی مالک ہیں۔ آپ شہر حیدرآباد کی خواتین کی جماعتوں میں شریک اور اُن کے مفید خلائق اعمال میں معاون ہیں۔ انجمن خواتین دکن کی سکریٹری ہیں اور اس سلسلے میں رفاہ عام و عوام کے متعدد فرائض انجام دے رہی ہیں۔ پروفیسر مرحوم کی اولاد میں ۳ لڑکیاں ہیں جن میں سے ایک بیاہی جا چکی ہیں اور صاحبِ اولاد ہیں اور دو آجکل یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں میں زیر تعلیم ہیں۔ اللہ کے فضل سے تینوں صاحبزادیاں علم و ہنر کے زیور سے مزین ہیں۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں پروفیسر صاحب کے چھوٹے بھائی معتضد ولی الرحمن سورت کے ایک کالج سے فلسفے کی لکچراری کی خدمت ترک کر کے حیدرآباد پہنچے اور جامعہ عثمانیہ میں نفسیات اور اخلاقیات کی لکچراری پر مامور ہوئے۔ جامعہ میں رفاقتِ عمل و شغل کے علاوہ دونوں بھائیوں کی یکجائی گوناگوں برکتوں اور خوبیوں کا سبب ہوئی اور چھوٹے بھائی کو تا دمِ آخریں اپنے بڑے بھائی کی محبت اور ہمدردی سے تقویت رہی۔ اور انہوں نے برادر بزرگوار کو ہمیشہ اپنے صحیح احترام اور ادب و لحاظ سے شاد و خورسند اور دعا گو رکھا۔ معتضد مرحوم نے بھی اپنے درس سے شاگردوں کو اور اپنے عالمانہ مضامین اور تصنیفات سے علم فلسفہ کے قدردانوں کو اپنا گرویدہ اور ثنا خواں بنا لیا تھا۔ حیف کہ ابھی انہوں نے اپنی عمر کے چالیس برس بھی پورے نہ کئے تھے کہ ان کے دل نے ان کو دھوکا دیا اور وہ اچانک مارچ سنہ ۱۹۴۱ء میں ملکِ بقا کی طرف راہی ہوئے۔ بڑے بھائی کے لئے یہ جدائی حقیقت میں جانکاہ ثابت ہوئی۔ ایک بیوہ بھاوج اور چھ بھتیجا بھتیجی کی یہ مصیبت خود اُن کے لئے ایک ناقابلِ برداشت آفت ہو گئی۔ یُوں پروفیسر جمیل الرحمن کے ذہن و دماغ کی یکسوئی ہی نہیں ختم ہو گئی بلکہ ان کی تمام شخصیت کو اور شب و روز کے ہر لمحہ کو اس سانحۂ عظمیٰ اور اس کے نتائج میں کچھ ایسا مبتلا کیا کہ خود اُن کے

دل کو ایک عارضہ لاحق ہوگیا۔ اور ذرا ذرا سے محرکات سے قلب میں اختلاج ہونے لگا۔ شروع میں تو انھوں نے اس شکایت کو محض اپنے جدید اور غیر معمولی مشاغل اور افکار کا نتیجہ سمجھا اور اس کے تدارک کے لئے معمولی سی تدابیر اختیار کیں۔ مگر بعد میں جب ان کو اپنی صحت کی اس کیفیت کی طرف سے زیادہ تنبہ ہوا تو تدارک اور استیصال کا وقت نکل چکا تھا۔ مختصر یہ کہ شکایت بڑھتی گئی، علاج ہوا، خیال ہوا کہ اب مستقل صحت ہوا چاہتی ہے کہ ۲۸ اگست ۱۹۴۲ء (مطابق ۲۲ مہر ۱۳۵۱ف) کی شام کو اپنے معمول کے مطابق سیر گشت سے واپس ہوکر مختصر سا کھانا کھانے کے بعد اپنے بچوں سے باتیں کرتے کرتے داعیٔ اجل سے دوچار ہوئے، اور یکبارگی اس جہانِ رنگ و بو سے رخصت ہوکر آب و گل کے علاقے سے آزاد اور دوسرے عالم کی طرف روانہ ہوگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا!

جامعۂ عثمانیہ کے ایک اہم شعبے کا پہلا اور نامور صدر یوں رخصت ہوا۔ جامعہ نے ایک دن کے لئے اپنے تمام مشاغل کو روک کر سوگ کیا۔ جنوب و شمال کے موقر و مقتدر اخباروں و رسالوں نے اس اہلِ قلم کے اٹھ جانے پر اپنے رنج و الم کا اظہار کیا اور ایک بیوہ ماں، چار بھائی، ایک بیوہ بی بی اور تین بچیاں اور بارہ بھتیجا بھتیجی ہمیشہ کے لئے اس کے شخصِ عنصری کے دیدار سے محروم ہوگئے۔ پروفیسر مرحوم اپنے والدین کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے بھائیوں میں سے محمد نعیم الرحمٰن الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی فارسی کے استاد ہیں، ڈاکٹر محمد عبد الرحمٰن بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ فنون کے صدر اور اسمٰعیل یوسف کالج میں فارسی کے پروفیسر اور پرنسپل ہیں، اور منقد رکلیم الرحمٰن اور معتز عبید الرحمٰن الٰہ آباد کے یکتا اور قلمرو ہند کے ممتاز اور مشہور ناشرِ کتب اور مکتبۂ کتابستان کے مدیر اور مالک ہیں۔

پروفیسر مرحوم کو اپنی اس ایک چوتھائی صدی کے قیام حیدرآباد میں اس ملک، حکومت اور شہر سے ایسا اُنس ہوگیا کہ وہ آخر میں بالکل طے کرچکے تھے کہ وہ وظیفہ یاب ہونے کے بعد (جس میں صرف تین سال کا حصہ باقی رہ گیا تھا)، باقی عمر بھی حیدرآباد ہی میں بسر کریں گے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ وظیفہ یاب ہونے سے

پہلے ہی اپنے اس محبوب وطن ثانی میں پیوند خاک ہوکر ہمیشہ کے لئے وہیں رہ جائیں گے۔ ان کی مراد پوری ہوئی۔ وہ نامپلی کے زنانہ مدرسے کے قریب درگاہ میں مدفون ہیں اور وہیں ان کے پاؤں کی طرف ملحق ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن بھی خواب راحت میں ہیں۔ یوں دونوں بھائیوں کو خاک میں مل جانے کے بعد بھی ایک دوسرے کی صحبت اور معیت حاصل ہے، جو شاید اہلِ ظاہر و باطن دونوں کے لئے ان کے آپس کی محبت اور شفقت کا کافی ثبوت ہے۔

پروفیسر محمد جمیل الرحمٰن مرحوم کے مزاج کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت اُن کی عزلت پسندی اور ماحول سے بے تعلقی تھی اور اپنی تعلیم کے زمانے میں شروع سے آخر تک ان کا یہہ رویّہ رہا کہ اپنی تعلیم گاہ میں عین درس ہونے کے وقت پہنچتے۔ اور "چھٹی کا گھنٹا" بجتے ہی اٹھ کر سیدھے گھر کو روانہ ہوجاتے اور راستے میں بھی کسی جگہ کسی تماشے یا عجوب چیز کے نظارے کو دیکھنے کے لئے نہیں رکتے تھے۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں جب لکچروں کے اوقات کے مابین کوئی وقت خالی ملتا تھا اُسے بھی وہ زیادہ تر دارالمطالعہ میں کوئی کتاب، اخبار یا رسالہ دیکھنے میں گزارتے تھے۔ یا چمن کے کسی گوشے میں جاکر تنہا بیٹھ جاتے تھے۔ اسکول کی دس جماعتوں کی تعلیم کے دوران میں گویا قسم کھانے کے لئے صرف ایک شخص ایسا تھا جسے وہ اپنا دوست کہتے تھے، مگر اس میں بھی ان کا قصور نہ تھا، بلکہ وہی خدا کا بندہ سر پڑ کے اُن کا "دوست" ہوگیا تھا۔ انٹر اور بی اے کے دوران میں البتہ ان کے چار پانچ دوست پیدا ہوگئے تھے۔ ان میں سے بھی دو ایک تو محض ٹینس کے کھیل کے رفیق تھے اور باقی فرصت کے خالی گھنٹوں کے۔ اور ان سے بھی کبھی اُن کی دوستانہ قسم کی بے تکلفی نہیں ہوئی۔ حد ہے کہ وہ اپنے گھر میں بھی عموماً اپنے بھائیوں سے علیحدہ ایک کمرے میں بند ہوکر مطالعہ کرنے کے عادی رہے (اور وہ مطالعہ بھی، جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، زیادہ تر درس سے غیر متعلق کتابوں کا ہوتا تھا)! البتہ شام اور سونے سے قبل کے وقت کو بھائیوں کے ساتھ ہنسنے بولنے میں گزارتے تھے۔ اور اس میں بھی عموماً درس اور درس گاہ ہی کے متعلق گفتگو ہوتی تھی۔ چونکہ یہ ایک جبلی چیز اور ان کے خصائل کی خصوصی کیفیت تھی، اس کا ان کے عادات و اخلاق پر گہرا اثر تھا۔ اور اس سے کئی نتیجے مترتب ہوئے۔ ایک تو یہہ کہ انہیں انسانوں کا زیادہ

تجربہ نہیں ہوا۔ اسی سبب سے وہ کسی شخص کو بُرا، بدخلق یا بدطینت نہیں سمجھتے تھے۔ اور نہ کسی کے بارے میں کسی کی رائے سنتے یا مانتے تھے تا آنکہ خود ان کو کسی کی طرف سے بُرا یا تلخ تجربہ نہ ہو۔ مگر ایک ہی دفعہ کے ایسے تجربے کے بعد پھر وہ کبھی اس کے قائل نہ ہوتے تھے کہ اُس شخص میں کوئی خوبی ہے یا اس سے بھلائی کی کوئی امید ہوسکتی ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ تھا کہ آدمیوں کی صحبت میں بیٹھکر بالکل بے تکلفی سے بات چیت کرنا انہیں کبھی نہ آیا۔ اور اس کا ایک فرعی نتیجہ یہ تھا کہ لوگ عموماً انہیں متکبر اور مغرور سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان میں تکبر نام کو بھی نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ہر نام نہاد یا فاضل کی فضیلت اور اس کے کمال کو آسانی سے تسلیم نہ کرتے تھے مگر انھیں خود اپنے علم و فضل پر کبھی غرّہ نہ تھا اور اسی لئے جب ان سے کسی امر کے بارے میں مشورہ کیا جاتا یا رائے لی جاتی تو غور و تامل کے بعد اپنی رائے یا خیال کا اظہار کرتے تھے اسی عزلت پسندی کا ایک اور اثر یہ تھا کہ وہ کوئی کھیل کھیلنا نہ جانتے تھے۔ ''درونِ خانہ'' قسم کے کھیلوں میں وہ صرف تاش کے کھیل سے واقف تھے اور وہ بھی برائے نام طور پر۔ لڑکپن میں اپنے بھائیوں کے ساتھ گھر کے اندر ہی اندر لڑکوں کا سا کرکٹ، فٹبال کھیل لیا کرتے تھے۔ کالج میں چونکہ شام کو میدان میں کھیلنا ضابطی طور پر لازم اور نہ کھیلنا باعث سزا و جرمانہ تھا اس لئے ان کو مجبوراً ٹینس کھیلنا پڑا اور چار برس تک نہایت شد و مد سے یہ کھیل کھیلا۔ اور یہی ایک کھیل تھا جسے انہوں نے عمر بھر نباہا۔ مگر اس میں بھی کبھی ماہرانہ کمال حاصل نہیں کیا۔ کالج میں ٹینس اس لئے کھیلا کہ لازمی تھا اور بعد کی زندگی میں اس لئے کہ یہ تفریح اور ورزش کی ایک شستہ، پاکیزہ اور باوقار صورت تھی۔ آخر آخر میں اسے بھی ترک کرکے ورزش کے لئے محض گشت اور کشتی کو اختیار کرلیا تھا۔

راقم کو خوب یاد ہے کہ پروفیسر مرحوم اپنے ایک استاد کی یہ نصیحت آخری وقت تک نہیں بھولے تھے اور اکثر یاد کرتے تھے کہ ''کبھی آدمیوں کا ذکر نہ کیا کرو بلکہ چیزوں کا ذکر کیا کرو تاکہ کسی کی غیبت یا بے وجہ ہجو نہ کرسکو''۔ اس نصیحت پر وہ نہایت سختی سے کاربند تھے، اور جب تک کسی صحبت میں، اس وقت کے ذکر یا گفتگو سے مجبور نہ ہوتے تھے، وہ عموماً اشخاص کو بُری طرح یاد کرنے سے سخت پرہیز کرتے تھے اور اگر کسی کے متعلق کوئی اعتراض کرتے بھی تھے تو نہایت مختصر مگر جامع طور پر اپنی رائے ظاہر کرتے تھے۔ ہنگامے اور شور و شغب

سے انہیں بہت الجھن ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ اسکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ کے کسی مظاہرے یا شور و شغب کی جمعیت میں شریک نہ ہوتے تھے۔ نہ کبھی کہیں میلے ٹھیلے میں جاتے تھے۔ اور انتہا ہے کہ اپنے گھر میں بھی اپنے بھائیوں، یا بعد میں اپنی اولاد کے، پُرشور ہنسنے بولنے میں شرکت کرنے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ اسی سبب سے وہ مختلف قسم کی ہنگامہ زا تقریبوں میں بھی حتی الوسع شریک نہ ہوتے تھے۔ اور غرور، تکبر، بے جا کنارہ کشی وغیرہ کے الزامات (جو ظاہر ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں محض غلط فہمی سے پیدا ہوتے تھے) برداشت کر لیتے تھے۔ خوشامد اور منھ دیکھے کی تعریف یا اظہار الفت سے انہیں سخت نفرت تھی، اور اسی لئے وہ خوشامد پسند اور درباردار اشخاص سے بچتے اور دور رہتے تھے۔ کرم اور نوازش کے حصول پر اپنی احسان مندی کا اظہار اور اعتراف کرتے تھے، مگر کبھی ایسی بات نہ کہتے اور کرتے تھے جس میں تملق یا خوشامد کا شائبہ ہو۔ وہ فطرتاً کم سخن تھے، نہ زیادہ بولتے تھے، نہ کسی کا زیادہ اور بے ضرورت اور زور سے بولنا پسند کرتے تھے۔ ان کے گھر پر بھی یہی فضا طاری رہتی تھی۔ اور ان کے بچوں کی بھی اسی انداز پر تربیت ہوئی تھی۔ شاید ان کی طبیعت کی اسی افتاد ہی کا نتیجہ کہ وہ کسی نئے مقام میں پہنچ کر راستے بہت عرصے کے بعد جانتے پہچانتے اور سمجھتے تھے اور اکثر بھٹکا کرتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے خود اپنا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جو یہاں لطف سے خالی نہ ہوگا۔ جب وہ شروع شروع میں حیدرآباد پہنچے اور دارالعلوم میں استاد تھے، تو عادت کے مطابق اکثر دارالعلوم تک کا راستہ بھول جاتے تھے۔ حالانکہ گل باغ سے دارالعلوم تک کا راستہ کچھ دور یا مشکل نہ تھا۔ ایک روز صبح کو دارالعلوم جانے کے لئے گھر سے نکلے اور راستہ بھول گئے۔ جب اِدھر اُدھر راستہ تلاش کرتے کرتے تھکنے لگے، اور یہ خوف بھی دامنگیر ہوا کہ اپنے فرضِ منصبی پر پہنچنے میں دیر ہوئی جا رہی ہے، تو تنگ آکر ایک عمارت میں سنبھلتے ہوئے داخل ہوئے کہ وہاں کسی بندۂ خدا سے دارالعلوم کا راستہ دریافت کریں۔ وہاں دو تین آدمی نظر آئے، ان سے راستہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ ماشاءاللہ دارالعلوم ہی میں کھڑے ہوئے اپنے روزانہ کے شاگردوں ہی سے یہ سوال کر رہے تھے! چنانچہ ان جوانوں نے سلام کیا اور کہا کہ "تشریف لائیے ہم لوگ آپ کے منتظر ہیں!" کہتے تھے کہ مجھے اس واقعہ سے کئی روز تک خفت رہی، اور جب یاد کرتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ یعنی راستہ تو

ایک طرف آپ اپنے روزانہ کے شاگردوں کو بھی اس وقت تک نہیں پہچانتے تھے ! بات میں بات نکلتی ہے یہ بھی ان کے مزاج کی ایک کیفیت اور ان کی طبیعت کی سادگی کی ایک شان تھی کہ ان کی نگاہ میں شرم و حجاب بہت تھا ۔ بچپن اور لڑکپن میں دہب سے بات کرتے شرماتے تھے اور ہمیشہ آنکھیں نیچی کئے رکھتے تھے ۔ بڑے ہوکر بھی ان کی یہ حالت باقی رہی ۔ گو سن و سال کے بڑھنے سے اس میں کمی آگئی تھی ۔ لڑکیوں اور عورتوں سے وہ کبھی عمر بھر بات نہ کرسکے ۔ جب کبھی جینڈمنٹ کے لئے بھی انہیں ایسا اتفاق پڑ جاتا تھا تو گھبراہٹ کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے ۔ ایک مرتبہ راقم کے (جو ان کی طبیعت اور مزاج سے خوب واقف تھا) سوال پر انہوں نے اعتراف کیا کہ کئی سال کی مشق کے بعد انہیں یہ ہمت ہوئی تھی کہ وہ اپنی جماعت کو درس دیتے ہوئے سر اُٹھا کر اپنے شاگردوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر متوجہ ہوں اور کلام کریں ۔ مجھے یقین ہے کہ پروفیسر مرحوم کے اکثر قدیم شاگرد میرے اس بیان کی تصدیق فرمائیں گے ۔

پروفیسر مرحوم صلۂ رحم کے اصول کے شدید قائل تھے ، اور اپنے قریب ترین سے دُور ترین کے اعزا اور قرابت داروں کے ساتھ مدارات اور حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے ۔ لیکن اس بارے میں ان کو " بدنصیب " کہنا شاید بے جا نہ ہوگا ، کیونکہ (ان کے والدین اور بھائیوں کو چھوڑ کر) اُن کے دیگر اعزّہ و اقربا کو ان کی طرف سے ہمیشہ یہ ایک عجیب نوع کی غلط فہمی رہی کہ وہ مغرور ہیں ، متکبر ہیں ، الگ رہنا چاہتے ہیں ، عزیزوں کی طرف سے لا پروا ہیں ، ان کو سب سے نفرت ہے اور وہ کسی کے خیر خواہ نہیں ، وغیرہ وغیرہ ، حالانکہ ان کے بارے میں یہ تمام رائیں قطعاً غلط ہی نہ تھیں بلکہ وہ ہمیشہ سب کے پُرسانِ حال اور اپنے مقدور اور وسعت کے مطابق سب کے مددگار اور غم خوار رہتے تھے ۔ خود اپنے بھائیوں سے ان کو اس درجہ محبّت بلکہ عشق تھا ، جس کا بیان اور اظہار آسانی سے ممکن نہیں اور یہی حال اُن کا اُن کے بھائیوں کی اولاد کے ساتھ بھی تھا ۔ وہ ان کی خوشی سے بے انتہا مسرور ہوتے ۔ اور ان کی تکلیف سے بے حد اذیّت اور الم محسوس کرتے تھے ۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ اپنے بھائی بھتیجوں کی خوشی پر بھی وہ اپنے جوشِ مسرّت و انبساط کے پُورے پُورے اظہار پر قدرت نہ پاکر آب دیدہ ہو جاتے تھے اور ان کے ہونٹ وفورِ انبساط سے کانپ کانپ کر رہ جاتے تھے ۔ ان کے والدِ ماجد کے انتقال کے بعد

انہوں سے ان کی یہ محبت اور بھی حد سے گزر گئی تھی اور ہمہ وقت سب کے لئے متفکر اور دعا گو رہتے تھے اپنے اعزہ کے بعد ان کو جو لوگ عزیز تھے وہ ان کے شاگرد تھے۔ اس میں ہرگز کسی طرح کا مبالغہ نہیں ہے کہ وہ اپنے طلبہ و تلامذہ کی مادّی اور ذہنی ترقی کے دل سے خواہاں رہتے تھے۔ اپنے ہونہار شاگردوں کی بہبودی کے لئے وہ وہ سب کرنا چاہتے اور کرتے تھے جو اُن سے ہو سکتا تھا۔ اپنے ذاتی علمی مشاغل اور مطالعے کے بعد ان کا محبوب مشغلہ یہی تھا کہ اپنے ذہین شاگردوں کے ذہن کو اور جِلا دیں اور انہیں قوم و ملک کا بہتر سے بہتر فرد بنائیں۔

ادبیات میں پروفیسر صاحب کو جن علوم سے خاص ذوق اور شغف تھا، ان کا ذکر تو اوپر ہو چکا ہے لیکن ان کا مطالعہ صرف ان علوم تک محدود نہ تھا، بلکہ مختلف متفرق اور متنوع قسم کے علوم و فنون ان کی توجہ کے جاذب اور ان کے اوقات کا مصرف تھے۔ اسلام کی خصوصیت کے بعد ان کو مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کا شوق تھا۔ اکابرِ عالم کے حالات کا ذوق، سیاحت ناموں میں ان کو لطف آتا تھا اور مختلف ممالک کی ادبیات کی تاریخ بھی ان کے لئے کشش رکھتی تھی۔ زبانوں کے مطالعے کا انھیں خاص شوق نہ تھا، اردو ان کی مادری زبان تھی اور اسی میں ان کو مدّت العمر درس دینے کا اتفاق بھی ہوا۔ لامحالہ وہ اپنی مادری زبان کے دلدادہ اور اس کی ترقی اور عالمگیری کے دل سے خواہاں تھے۔

اُردو ادب کی بہترین کتابیں، خواہ وہ کسی فن کی ہوں، اُن کے مطالعے سے گزرتی رہتی تھیں۔ شعر سے اُن کو خاص رغبت نہ تھی مگر اُردو کے اکابر شعراء کے کلام اور رجحان سے بخوبی واقف تھے۔ شعرائے حال میں سے اقبال لاہوری ہی کے کلام کو وہ مطالعے اور غور کے قابل سمجھتے تھے اور بس۔ فارسی انہوں نے سبقاً سبقاً تو صرف دسویں درجے کے نصاب تک پڑھی، لیکن اس زبان کی تاریخ، شعر اور مذہبیات کے ادب پر ان کی نگاہ حاوی تھی۔ فارسی نثر میں وہ سعدی اور نظام الملک طوسی کے مداح تھے۔ اور شعر میں وہ منطق الطیر کو ایک حسین نظم اور فردوسی کے شاہ نامے اور مولانا رومی کی مثنوی کو شعر عالم میں بلند ترین پائے کا مالک سمجھتے تھے۔ آخر الذکر کا وہ اکثر اور بار بار مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عربی سوابی اے کے شروع سے آخر تک

اُن کے سبقوں کا جزء رہی اور تعلیم ختم کرنے کے بعد آخری وقت تک اس زبان کے علوم اُن کے مطالعے کا مرکز بنے رہے۔ جرمانی زبان انہوں نے محض اپنے مطالعات کی توسیع اور توثیق کی غرض سے سیکھی تھی۔ اس سے زیادہ انہیں اس کی ادبیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ عجیب امر یہہ ہے کہ گو ان کی تعلیم یعنی لڑکپن اور نوجوانی کا تمام زمانہ لاہور میں گذرا مگر پنجابی زبان انہیں کبھی نہ آئی۔ لاہور اور اس کے مضافات اور قرب وجوار کے اضلاع کی پنجابی وہ کچھ تو لیتے تھے مگر بول بالکل نہ سکتے تھے۔ اس حسین و دلکش زبان کی صرف ایک مثل تھی، جو انہیں بہت پسند تھی۔ اور کبھی کبھی اسے استعمال بھی کرتے تھے۔ پنجابی کا وہ ایک فقرہ ان کے پنجابی نطق کی کل کائنات تھی! انگریزی کا تو خیر ذکر ہی کیا، کہ وہ ہمارے ملک کے ہر صحیح قسم کے تعلیم یافتہ فرد کے علم اور استعمال میں ہے، اور ابھی عرصے تک رہے گی۔

پروفیسر مرحوم کے عقائد "مذہبی" اور رجحانات دینی کے متعلق اگر کچھ عرض نہ کیا جائے تو شاید اس تحریر کو ناقص یا تشنہ تصوّر کیا جائے گا۔ اس بارے میں وہ خوش نصیبی سے ایسے ماں باپ کے فرزند تھے، جن کو ایک طرف تو اپنے دین (اسلام) کا نہایت درجہ پاس تھا، دوسری طرف وہ اپنی اولاد کے مذہب اور عقیدے میں کسی تقشف یا تنگ نظری کے روادار بھی نہ تھے، لہذا پروفیسر جمیل الرحمن کے "عقائد" کا مجمل احوال یہہ ہے کہ وہ اپنے والدین اور صحیح الخیال اساتذہ کی تربیت تعلیم اور تلقین کے مطابق خالص مسلمان تھے۔ نبیؐ اُمّی صلعم کو "بعد از خدا بزرگ" اور انسانیت کے تمام کمالات کا جامع، اہل عالم کا بہترین اور کامل ترین ہادی اور بیک لفظ رحمۃ اللعالمین سمجھتے تھے۔ قرآن کو بہترین اور کامل ترین اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی تعلیمات کا حامل جانتے اور حتّی الوسع اس پر عامل ہونے میں ساعی رہتے تھے اور اسی تعلیم کی پیروی میں وہ دیگر مذاہب کے اصول و مبانی سے واقف ہوکر ہر دین و مذہب کے روادار تھے۔ اور کسی شخص یا جماعت کو محض اس سبب سے کہ اسے اسلام اور قرآن سے تعلق حاصل نہیں ہے، حقارت یا نفرت کا سزاوار نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح خود اسلام کے مختلف فرقوں میں سے نہ کسی کے وہ مدّاح تھے، نہ کسی سے متنفر، بلکہ وہ ہر فرد بشر کو اپنے اپنے مذہب و مسلک پر سلوک و قیام کا مختار سمجھتے ہوئے ہر شخص سے مساویانہ انسانیت اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔

جمیلُ الرّحمن طبعاً کم سخن اور مختصر گیر آدمی تھے۔ بات بھی مختصر کرتے تھے اور کام میں بھی مناسب طور پر عجلت اور اختصار برتتے تھے۔ چونکہ ظاہرداری اور تصنع سے انہیں نفرت تھی، اس لئے بات صاف، مختصر اور سچی کرتے تھے۔ شاید یہی سبب تھا کہ وہ شعر کے شوقین نہ تھے اور پیچیدہ کلام سے انہیں اُلجھن ہوتی تھی۔ یہ ایک معروف امر ہے کہ بہ نسبت نثر کے شعر (نظم) مختصر ہوتا ہے، لہٰذا وہ ایسے شخص کو محبوب ہونا چاہیئے، مگر وہ شعر پڑھتے اور خاص کر سناتے ہوئے اس قدر گھبراتے تھے کہ اکثر شعر کا وزن خراب کر دیتے تھے، اور کبھی اتنا گھبراتے اور ایسی سُرعت سے شعر خوانی سے عہدہ برآ ہو جانا چاہتے تھے کہ شعر پڑھتے پڑھتے بھول جاتے تھے اور اس کا مفہوم اور مقصد اپنے الفاظ میں نثر ہی میں بیان کر دیتے تھے۔ اُن کی اس ذہنی عجلت پسندی کی ایک اور عجیب کیفیت یہ تھی کہ وہ اکثر و بیشتر کسی لفظ کے معانی کی تلاش میں لغات کی کتاب دیکھتے ہوئے الف، بے، تے یا اے، بی، سی کی صحیح ترتیب ابجدی بھول جاتے تھے اور جب بار بار کی ورق گردانی پر بھی مطلوب لفظ نہ پاتے تو تنگ ہو کر ابجد کو شروع سے آخر تک دُہراتے تب کہیں اپنے منظور حرف کے مقام کا اندازہ قائم کر کے لغات میں لفظ نکال سکتے تھے۔ طبیعت میں نہایت درجہ سادگی تھی، لیکن اس کے ساتھ پاکیزگی بھی شرط تھی۔ ان کا لباس، ان کا مکان، ان کا اثاث البیت، کتب خانہ، کتابیں، خور و نوش کی اشیاء، اور کھانے غرض کہ ان کی ہر چیز میں سادگی، پاکیزگی اور خرچ میں میانہ رَوی نمایاں تھی۔ وہ اپنے اوقات کے نہایت پابند تھے۔ شب و روز کے کام متعیّن کر لیتے تھے اور ہر کام مقررہ وقت پر کرتے تھے۔ امورِ خانہ داری اور روزانہ ضروریات کا انصرام و اہتمام بی بی کے سپرد تھا۔ اور نہ وہ ان امور میں دخل دیتے تھے اور نہ اپنے کرنے کے کاموں میں ان کا دخل چاہتے تھے۔ زندگی بھر اُن کا یہ رَوَیّہ رہا اور پُوری کامیابی سے یہ رسم و طور جاری رہا۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اُن کی رفیقِ حیات نے اُن کی زندگی بھر ان کے اطوارِ حیات میں کامل رفاقت کی اور اُن کے حسبِ خواہش و امید اُن کے تمام اعمال و افکار میں ایک صحیح انیس اور معاون کی طرح مدد کی۔

پروفیسر جمیل الرحمن کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ ان کی تعلیم کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ابھی وہ ایم اے کے طالب علم تھے کہ ان کے قلم سے چند مضامین نکلے، جو اورمستشرق عالموں کے مقالوں کا ترجمہ تھے، اور

لاہور کے رسالۂ مخزن میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے بعد ان کی کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور ان کے ساتھ ساتھ مضامین اور مقالات بھی نکلتے رہے۔ ذیل کی فہرست سے اُن کے قلم کی پیداوار کا اندازہ ہوگا۔ ان کی تصنیفات کی دو ہی نوعیتیں رہیں اور ہوسکتی ہیں:۔ ترجمہ اور تالیف۔ اُن کے ترجموں کے بارے میں شاید صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا وہ اپنے باپ کے بیٹے تھے۔ اور ترجمے کی قابلیت اور اہلیت اُن کو باپ سے ورثے میں ملی تھی جو اہلِ علم و دانش مولوی محمد خلیل الرحمٰن مرحوم کے تراجم اور اُن کی خوبیوں سے واقف ہیں، انھیں پروفیسر مرحوم کے تراجم پر اعتقاد کرلینا دشوار نہ ہوگا۔ ان کی تالیفات اور مقالات کی شان خالص محققانہ ہے۔ ان کے طرزِ تحریر یعنی اسٹائل کے باب میں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ اس میں کوئی واضح خصوصیت نہیں ہے، اور یہ اُن کی طبیعت کا اقتضا تھا۔ چونکہ ان کا مضمون اور موضوع فنِ تاریخ تھا، اور وہ تاریخ میں کسی قسم کی عبارت آرائی اور رنگین بیانی کے قائل نہ تھے۔ اس لئے ان کی تحریر میں ان چیزوں کو تلاش کرنا یا اس بنا پر تعریف و مذمّت کرنا بجا و درست نہ ہوگا۔ لکھنے میں جو امر ان کا مدنظر ہوتا تھا وہ صرف یہ کہ جو بات کہی جائے وہ صاف، سادہ، راست اور واضح طور پر ادا ہو کہ پڑھنے والا بحث کے موضوع کو آسانی اور روانی کے ساتھ سمجھتا اور اخذ کرتا چلا جائے، اور یہ بات اُن کی تحریر میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نہ کہیں عبارت آرائی ہے، نہ رنگین بیانی، نہ تطویل لاطائل ہے، نہ اختصار و ابہام ہے، نہ شعر و سخن یا اقوال و امثال سے زینت کا سامان بہم پہنچایا گیا ہے جس امر کا اظہار منظور ہے صاف و سادہ زبان میں پیش کیا گیا ہے اور جو رائے ظاہر کی گئی ہے بے لاگ طرح سے دل نشین طور پر بیان کی گئی ہے، اور بس۔ اب اس اندازِ کلام کو جیسا بھی سمجھا جائے بجا ہے۔

پروفیسر مرحوم کے تصانیف کی فہرست یہ ہے:۔

۱۔ رسائل، یعنی مضامین:۔ علاّمہ ابنِ خلدون، ذکرِ فتح اندلس (۱۹۱۶ء میں لاہور کے مخزن میں بہ اقساط شائع ہو کر بعد میں ایک مستقل کتاب کی صورت میں آئی)، بدھ مذہب کا اثر اسلام پر (۱۹۱۶ء)، علاّمہ البیرونی اور تصوّف (۱۹۱۷ء)، سامی اقوام کی چند خصوصیات (۱۹۱۷ء)، ابن رشد اور تاویلات (انگریزی ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء)، میمون اور صدق دین (انگریزی ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء)، خلیفہ منصور عباسی (۱۹۱۹ء) خراج

سلطنتِ اسلام میں (سنہ ۱۹۲۰ء)، ابن خلدون کے خیالات عمران پر (سنہ ۱۹۲۱ء)، افریقہ میں دولت عبیدیین کی ابتدا (سنہ ۱۹۲۲ء)، عرب اور علوم عرب، عبیدئین مصر کا نسب، مختصر تاریخ عقلیہ (تینوں، سنہ ۱۹۲۲ء)، قاضی تنوخی (سنہ ۱۹۲۳ء)، دوآبہ دریائے جیحون و سیحون کی تاریخ پر ایک نظر (سنہ ۱۹۲۵ء)، امام ابن حزم ظاہری (سنہ ۱۹۳۰ء)، مدینۃ السلام (سنہ ۱۹۳۶ء)، سیف الدولہ حمدانی (سنہ ۱۹۳۷ء)، عربوں کی خانگی زندگی (سنہ ۱۹۳۷ء)، عہدِ وسطیٰ کی تاریخِ مصر پر ایک نظر (سنہ ۱۹۳۸ء)، خلیفہ المعتصم باللہ، منبر اور عصا (سنہ ۱۹۳۹ء)، خلافت وسلطنت (از امیر حسن صدیقی) پر ایک نوٹ (سنہ ۱۹۴۰ء)، احمد بن المدبر (سنہ ۱۹۴۱ء)، بحیرۂ روم میں عربوں کی فتوحات، (سنہ ۱۹۴۰ء، سنہ ۱۹۴۱ء)، عرب مصر میں (سنہ ۱۹۴۱ء)، عہدِ وسطیٰ میں مصر کی معاشی حالت (سنہ ۱۹۴۰ء)، قرطاس اور اس کا استعمال (سنہ ۱۹۴۱ء)، ابو العلاء المعری (سنہ ۱۹۲۲ء)، مصر آل طولون کے عہد میں (سنہ ۱۹۴۲ء)، اخبار الاندلس کا مقدمہ

ب۔ کتابیں:۔ ذکر فتح اندلس (سنہ ۱۹۲۳ء)، تاریخ مغرب (سنہ ۱۹۲۴ء)، ابن رشد کا فلسفہ (انگریزی، سنہ ۱۹۱۷ء)، قدیم تاریخِ ہند (سنہ ۱۹۲۲ء)، خلافتِ بنو اُمیہ (سنہ ۱۹۲۲ء)، جغرافیہ خلافتِ مشرقی (سنہ ۱۹۳۱ء)، مسلمانوں کی صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت (سنہ ۱۹۳۲ء)، افتتاح الاندلس (سنہ ۱۹۴۲ء)۔

یہ سب وہ تراجم، تالیفات اور تصنیفات ہیں جو متفرق رسائل اور کتابی شکل میں طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ جو تالیفات اور تراجم وغیرہ ابھی طبع نہیں ہوئے اُن کی فہرست یہ ہے:۔

بزمِ سیف الدولہ حمدانی، سیف الدولہ (ترجمہ از جرمانی بہ انگریزی)، تقویم العرب قبل الاسلام (نامکمل)، تاریخ افرنجہ (ترجمہ از فرانسیسی)، پہلی صدی ہجری میں مصر کی محاصلی حالت، مصر میں عربیت کا ارتقاء، آلِ طولون سے قبل مصر کی معاشی زبوں حالی (ترجمہ از جرمانی)، اسلامی عدالت میں وکالت (ترجمہ از جرمانی)، آلِ ایوب کا نظامِ جاگیرات (ترجمہ از انگریزی)، عہدِ وسطیٰ میں مصر کی حکومت اور نظم و نسق (ترجمہ از جرمانی)، مصر عہدِ وسطیٰ میں، علم و ادب اور فنونِ لطیفہ، اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مصر کی معاشی حالت اور نظم و نسق کا ایک خاکہ، بیعت، عربی کے لفظ ناموس کی حقیقت اور اس کا مفہوم، سیاسیات فارابی (نامکمل)، یعقوب بن لیث الصفار، سلطنتِ اسلامی کے زمانۂ عروج کا محصول اراضی، حکومتِ الٰہیہ میں رسول کا مقام (انگریزی)

اسلام آخری حکومت الٰہیّہ ہے (انگریزی)، خلیفہ عبدالملک اموی (ترجمہ از جرمانی)، گھوڑے عربی ادبیات میں۔
اس فہرست کی طوالت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پروفیسر مرحوم کس قدر لکھتے تھے ۔ اگر یہ کل ذخیرہ ایک یا دو یا زائد مجلدات میں شائع ہو جائے تو اردو ادبیات میں کتنا کچھ قابلِ قدر اضافہ ہوگا! اور یہ تاریخ اسلام کی کتنی بڑی خدمت ہوگی ۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ سعادت کس ادارے یا ناشر کی قسمت میں ہے۔

محمد نعیم الرحمٰن

الٰہ آباد ۱۲ مارچ ۱۹۴۳ء

# غالب کی اُردو شاعری

شاید ہی کسی اُردو شاعر کے متعلق نقّادانِ سخن میں اتنا اختلافِ رائے ہو جتنا کہ غالب کے متعلق ہے۔ اگر ایک گروہ اُسے "خدائے سخن" اور "رب النوع" تسلیم کرتا ہے تو دُوسرا محض ایک معمولی سخنور قرار دیتا ہے جس میں عظمت شاعری کا کوئی عنصر موجود نہیں۔ ایسی صورت میں ادب کے ایک طالب علم کے لئے جو خلوصِ نیّت کے ساتھ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ فی الواقع غالب کا درجہ اُردو شاعری میں کیا ہے بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ اور وہ ان نقادوں کی مختلف بلکہ متضاد رائے سے سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ ہماری اس تقریر کا دراصل یہی منشاء ہے کہ ان مختلف آراء کی تحقیق و تنقید کر کے غالب کا اصل مقام متعیّن کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ بتایا جائے کہ کسی شاعر کے مطالعے کا صحیح طریقہ کیا ہو سکتا ہے جس کے ذریعے ہم اس کے متعلق ذاتی رائے قائم کر سکیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا غالب کے موافق اور مخالف دونوں گروہوں نے اس کی شاعری کے متعلق ایسے مبالغہ آمیز خیالات ظاہر کئے ہیں کہ وہ افراط و تفریط کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری جیسے فاضل ادیب نے جوشِ عقیدت میں کلامِ غالب کے متعلق جیسی غیر معتدل رائے ظاہر کی ہے، وہ تنقیدی بے راہ روی کی ایک نہایت عجیب اور دلچسپ مثال ہے۔ وہ مقدمۂ دیوانِ غالب کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مُقدّس اور دوسری دیوانِ غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں۔ لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں ہے۔ کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔"

اس کے بعد بجنوری نے محاسن کلام غالب کی جو طویل فہرست سو سوا سو صفحوں میں پیش کی ہے وہ اتنی عجیب اور ہمہ گیر ہے کہ فصاحت، بلاغت، مصوری، نقاشی، موسیقی، فلسفہ، تصوف، حکمت، فلکیات، طب [illegible] جتنے علوم و فنون ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی چھوٹنے نہیں پائی جسے انہوں نے کلام غالب سے ثابت کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس غیر محتاط تنقید اور غلط جوش عقیدت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس کا ردّ عمل ہو۔ چنانچہ اس کے بعد سے کئی ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اس کے جواب میں تصویر کا صرف دوسرا رخ پیش کیا ہے جسے دیکھ کر غالب کی شاعرانہ حیثیت اکثر لوگوں کے لئے معمہ بن گئی ہے اور ایک مخلص و منصف نقاد کا کام بہت مشکل ہو گیا۔ قبل اس کے کہ ہم افراط و تفریط کی ان دو حدوں سے ہٹ کر کلام غالب پر ایک غیر جانب دارانہ نظر ڈالنے کی کوشش کریں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقے کا تعین کر لیا جائے۔ جو کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں اختیار کرنا چاہیئے۔

عام طور پر کسی شاعر یا مصنف کے مطالعے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔

(۱) سلسلہ وار یا ارتقائی طریقہ:۔ اس میں ہم کسی مصنف یا شاعر کے کلام کا مطالعہ اس سلسلے سے کرتے ہیں جس سے کہ وہ عالم وجود میں آیا۔ اس طرح ہم اس کے ارتقائے تدریجی سے واقف ہو سکتے ہیں اور جو ذہنی تبدیلیاں وقتاً فوقتاً اس میں رونما ہوتی رہی ہیں اس کا اندازہ اس کے کلام سے لگا سکتے ہیں۔

(۲) دوسرا طریقہ توازن و تقابل کا ہے۔ اس طریقے میں ضروری ہے کہ ہم اپنے مخصوص شاعر کا مقابلہ اس عہد کے اور اس صنف کے دوسرے باکمالوں سے کریں۔ اس طرح ہم یہ اندازہ کر سکیں گے کہ اس کا درجہ اس صنف میں اور اس کا مرتبہ دوسرے شعراء کے مقابلہ میں کیا ہے۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی شاعر کا مطالعہ اس عہد کے خصوصیات اور رجحانات کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے جس میں اس نے اپنا کلام پیش کیا ہے اس طرح ہم اس کا اندازہ لگا سکیں گے کہ وہ اپنے ماحول سے کس درجہ متاثر ہوا اور اس کے ساتھ اس نے اپنی شخصیت سے اپنے ماحول کو کس حد تک متاثر کیا۔ آیئے اب ہم حسب موقع ان تینوں طریقوں کی مدد سے کلام غالب پر ایک نظر ڈالیں۔ غالب کے ایک نقاد (ڈاکٹر لطیف)

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "غالب خواہ کچھ ہی سہی لیکن سب سے اوّل وہ ایک غزل گو شاعر تھا" یہی واقعہ بھی ہے کہ آج غالب کا نام جس چیز نے اردو شاعری میں زندہ رکھا وہ صرف اس کی غزلیات ہیں۔ پس ضروری ہے کہ کلامِ غالب پر نظر ڈالتے وقت ہم اردو غزل گوئی کی عام خصوصیات، بالخصوص غالب کے زمانے کے غزل گو شعرأ کے رجحانات اور عام رنگ کو پیشِ نظر رکھیں۔ اس طرح تاریخی پس منظر اور معاصرانہ توازن و تقابل کے بعد ہی ہم کلامِ غالب کا صحیح اندازہ اور اس شاعر کے صحیح مقام کا تعین کر سکیں گے۔ یہہ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ غزل کوئی مسلسل اور مربوط طرزِ نظم نہیں بلکہ مفرد اشعار کا ایک ایسا بے ربط مجموعہ ہے جس میں باہم کوئی تعلق نہیں پایا جاتا بلکہ ہر شعر ایک جدا اور مستقل مضمون رکھتا ہے۔ اسی لئے جن قوموں کے کان اس طرزِ سخن کے عادی نہیں وہ اس صنف کو مہمل سمجھتے ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ صرف ایک شعر میں کسی ایک مستقل خیال کو حسن و لطافت کے ساتھ بہ کمال و تمام ادا کرنا سخت مشکل کام ہے۔ جب ہم غالب کے زمانہ کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ شاعری بالکل میکانی چیز بن گئی تھی یعنی اس کے لئے کسی فطری ذوق اور طبعی مناسبت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ یہہ ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور ایک شائستہ آدمی بننے کے لئے ہر کس و ناکس کو ضرور تھوڑا بہت شاعر بننا پڑتا تھا۔ مشاعروں کی ہر جگہ گرم بازاری تھی جس میں فکرِ سخن کے لئے چن چن کر ایسے مصرعے دیئے جاتے جن کی ردیفیں اور قافیے نہایت مشکل ہوتے اور ان سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرنا ہی منتہائے کمال سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح شاعری اصلی جذبات و احساسات کی ترجمانی کے بجائے محض مقررہ ترکیبوں اور رسمی پابندیوں کی تکمیل کا نام ہو گئی تھی، اور بڑے بڑے شعرا کا کلام بھی محض ایک لفظی بازی گری بن کر رہ گیا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ لکھنؤ میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا اس کے لئے جو مصرعہ طرح دیا گیا اس کی ردیف تھی "درخت" اور قافیہ ہزار، بہار وغیرہ۔ اس میں ناسخ نے جو غزل کہی تھی اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

تو نے تکدر ہلائے، کیوں نہ کریں باغِ عالم میں اُٹھا ردرخت

ان سب پر طرہ یہہ کہ اس زمانے میں رعایتِ لفظی اور محاورات و روزمرہ کے استعمال کا اس قدر زور تھا

گویا شاعری اسی سے عبارت تھی۔ شعرا کی تمام تر فکرِ سخن اس پر مرکوز تھی کہ اشعار میں کسی طرح محاورے باندھ دیے جائیں اور رعایتِ لفظی کا التزام کر دیا جائے۔ خواہ اس سے شعر کا مضمون کتنا ہی پست و مبتذل ہو جائے اس رجحان نے ہماری شاعری کو جس قدر رسوا کیا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ معمولی شاعروں کا کیا ذکر اس عہد کے ممتاز ترین شعرا کا کلام دیکھ کر جن سے جلدوں کی جلدیں بھری پڑی ہیں آج ہم شرم سے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثال کے لئے میں صرف چند شعر پیش کروں گا۔ جو نسبتاً زیادہ شائستہ اور لطیف ہیں۔

ذوق کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحادِ حسن و عشق — زُلف واں شانہ نے کھینچی درد ہے یاں شانہ میں

〃 دیکھنا ملّت و دیں دونوں ہیں برباد کہ آج — باد کے گھوڑے پہ وہ دشمنِ ایماں چڑھا

〃 تیز چٹکی میں لیا اس نے پئے جانِ عدو — رشک سے میرے دل میں کیا کیا چٹکیاں لینے لگا

〃 نیچہ جب مول وہ بانکا جو اں لینے لگا — موت کے جی میں مزے یہ نیچیاں لینے لگا

غرض غزل گوئی کے اس عام مذاق اور رنگ کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم غالبؔ کا کلام دیکھتے ہیں تو اس میں اور دوسرے شاعروں کے کلام میں (خواہ وہ غالبؔ کے معاصرین ہوں یا متقدمین یا متاخرین) زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح ہم خود بخود مطالعے کا تقابلی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس سے غالبؔ کی شاعرانہ حیثیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم دوسرے شعرا کے ہم مضمون اشعار لے کر غالبؔ سے ان کا مقابلہ کریں تاکہ حسنِ بیان کا باہمی فرق معلوم ہو سکے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ہی زمین میں مختلف شعرا کی جو غزلیں ہیں، ان کا مقابلہ غالبؔ کی ایسی غزل سے کیا جائے جو اسی زمین میں ہو۔ اس طرح ہم ان کے تخیل اور مضمون آفرینی کا مقابلہ کر سکیں گے۔ گویا پہلی صورت حسنِ بیان جانچنے کی ہے اور دوسری صورت حسنِ خیال جانچنے کی۔ اس طرح جب ہم غالبؔ کا مقابلہ دوسرے غزل گو شعرا سے کرتے ہیں تو کلامِ غالبؔ کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی "ندرت" معلوم ہوتی ہے۔ یہ ندرت آپ کو خیال اور زبان دونوں میں اتنی واضح اور نمایاں ملے گی کہ آپ اسے کلامِ غالبؔ کی خصوصیات میں سر فہرست شمار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بلکہ یہ کہا

جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ غالب کی یہی وہ خصوصیت ہے جسے ہم اس کا مابہ الامتیاز کہہ سکتے ہیں جس سے اس کا کلام صاف اور دوسروں سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اسے وہ شہرت حاصل ہوئی ہے جو اردو کے کسی اور غزل گو شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔ یہ جدتِ خیال اور ندرتِ بیان غالب کے لئے کوئی اکتسابی اور مصنوعی چیز نہ تھی بلکہ اس کی ہستی کے تار و پود میں گتھ گئی تھی اور اس کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئی تھی اس کی مثالیں آپ کو حیاتِ غالب کے ہر صفحے پر بہ کثرت ملیں گی۔ کہ کس طرح وہ اپنے زندگی کے ہر شعبہ میں عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ حتّٰی کہ روزمرہ زندگی کی معمولی معمولی باتوں میں بھی وہ عوام کا ساتھ دینے کے بجائے کسی جدت سے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ غالباً آپ نے اُن کا وہ خط پڑھا ہوگا جس میں وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ ”اس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ہے۔ ملا۔ حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا۔ مُنہ پر ڈاڑھی رکھتا ہے اور سر پہ بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈھا دیا۔“ ظاہر ہے کہ جو شخص ایسی معمولی باتوں میں دوسروں کی تقلید پسند نہ کرے وہ اپنے کلام میں جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا، کسی کی تقلید کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے تو وہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اشعار میں کوئی اچھوتا خیال پیش کریں اور جب کبھی یہ ممکن نہیں ہوتا تو وہ پامال مضامین کو بھی اپنی ندرت بیان کا ایسا جامہ پہنا دیتے ہیں کہ وہ بالکل نیا معلوم ہونے لگتا ہے، بھرتی کے اشعار، عامیانہ خیالات، سوقیانہ مضامین، محاورات کا استعمال اور رعایتِ لفظی کا التزام جن سے اردو کے بڑے بڑے شعراء کا کلام بھی بھرا پڑا ہے اور جو خصوصیت کے ساتھ غالب کے زمانے میں شاعری کا کمال سمجھے جاتے تھے اِن کی مثالیں غالب کے دیوان میں ایسی خال خال ملیں گی جو مثل نہ ہونے کے ہیں۔ مثال کے طور پر میں آپ کو ذوق اور غالب کی ایک ایک غزل سُناتا ہوں جو اگرچہ ایک ہی زمین میں نہیں لیکن ملتی جلتی ہیں یعنے ردیف ایک ہے اور قافیہ میں صرف یائے معروف اور یائے مجہول کا فرق ہے۔

ذوق ؎ یاں تک عدو زمانہ ہے مردِ دلیر کا — جھلسے ہیں مُنہ، شکار کئے بھی شیر کا

# "جنون"

بیگم کی محبت اب تو جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ آج میں وقت سے پہلے دفتر سے نکل پڑا۔ جب گھر پہنچا بیگم ٹیلیفون کا نمبر ملا رہی تھی۔ دو، چھ، سات، چار، وغیرہ اور کچھ زیر لب گنگنا رہی تھیں ہلو...... کہاں سے۔ ہاں۔ دیکھیے چار بجنے پندرہ منٹ باقی ہیں۔ جلد آئیے گا میں آپ کا سختی سے انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر پہلے باہر آپ کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھی شاید آپ آگئے۔ دوڑ کر باہر دیکھا۔ بُری طرح زک اٹھانی پڑی۔ میری اس وحشت پر نوکر منھ چھپا کر ہنسنے لگے۔ میں شرم کے مارے پانی پانی ہوگئی۔ خدا جانے یہ محبت کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ آپ کو تو لطف آتا ہوگا نا۔ میری ان حرکتوں پر خوب ہنسنے بھی لگے۔ ہلو۔ ہم نے ایک افسانہ بھی لکھا ہے۔ کچھ حصّہ سُنو گے سنیئے۔

"انہوں نے اپنی کشتی کو پانی کی لہروں میں بہا دیا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چلنے لگے۔ ریحانہ کی کالی کالی لٹیں ہوا میں لہرانے لگیں۔ سراج کی ٹائی۔ چاند آسمان پر بہہ رہا تھا۔ کائنات نور کی چاندنی میں نہا رہی تھی۔ سراج کشتی کھے رہا تھا اور ریحانہ سامنے پانی کی لہروں میں زندگی کی انتہائی مسرتوں کو ڈھونڈھ رہی تھی۔ سراج کے ہاتھ کشتی کھینے سے دُکھ گئے۔ اس نے ریحانہ کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔ ریحانہ اِدھر دیکھو۔ ہماری طرف۔ ہم ایک کہانی سناتے ہیں کشتی یوں ہی بہہ رہی تھی۔ ریحانہ کی انگلیاں سراج کے بالوں میں پھرنے لگیں۔ اور اس کی نظریں سامنے کے کنٹے پر جانے والے دو مرجھائے ہوئے چہروں پر تھیں۔ کالا رنگ، برہنہ جسم، کندھے پر ایک کمبل۔ ہاتھ میں ایک ڈنڈا۔ کہاں جا رہے ہیں یہ مسافر؟ ان کی زندگی کس رخ بہہ رہی ہے؟ وہ ان سوالات میں غرق تھی۔ انور نے ریحانہ کا بازو ہلاتے ہوئے کہا کس سوچ میں ہو۔ "ہاں" ریحانہ چونک اٹھی اور پوچھا "سراج ہم کہاں جا رہے ہیں؟" "اپنی منزل کی طرف" سراج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "پسند آیا افسانہ۔ باقی گھر آکر سن لیجیے۔ دیکھیے چار بجنے پانچ منٹ باقی ہیں۔ آپ کے آنے تک میں کافی تیار رکھتی ہوں۔ جلد آئیے۔۔۔ ہاں! کیا کہا غلطی ہوگئی!! قہقہے لگاتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے بیگم کہیں کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ شرمائی ہوئی۔ اور ہم نے ان کو گود میں اٹھا لیا۔ انہوں نے اپنا چہرہ ہماری ٹائی میں چھپانا چاہا۔ چھوڑ دیجیے کوئی دیکھ لے گا۔ ہوں ہوں۔ روحی سناؤ نا باقی کہانی۔ اب تو ہم آگئے۔ گھڑی نے ٹن ٹن چار بجائے۔۔۔ سیّد محی الدین احمد متعلم بی اے آنرز

جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ غالبؔ کی یہی وہ خصوصیت ہے جسے ہم اس کا مابہ الامتیاز کہہ سکتے ہیں جس سے اس کا کلام صاف اور دوسروں سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اسے وہ شہرت حاصل ہوئی ہے جو اردو کے کسی اور غزل گو شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔ یہ جدّتِ خیال اور ندرتِ بیان غالب کے لئے کوئی اکتسابی اور مصنوعی چیز نہ تھی بلکہ اس کی ہستی کے تار و پود میں گتھ گئی تھی اور اس کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئی تھی اس کی مثالیں آپ کو حیاتِ غالبؔ کے ہر صفحے پر بہ کثرت ملیں گی۔ کہ کس طرح وہ اپنے زندگی کے ہر شعبہ میں عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ حتّٰی کہ روزمرہ زندگی کی معمولی معمولی باتوں میں بھی وہ عوام کا ساتھ دینے کے بجائے کسی جدّت سے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ غالباً آپ نے اُن کا وہ خط پڑھا ہوگا جس میں وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ ''اس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ہے۔ ملا۔ حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا۔ منہ پر ڈاڑھی رکھتا ہے اور سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈھا دیا۔'' ظاہر ہے کہ جو شخص ایسی معمولی باتوں میں دوسروں کی تقلید پسند نہ کرے وہ اپنے کلام میں جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا، کسی کی تقلید کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے تو وہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اشعار میں کوئی اچھوتا خیال پیش کریں اور جب کبھی یہ ممکن نہیں ہوتا تو وہ پامال مضامین کو بھی اپنی ندرتِ بیان کا ایسا جامہ پہنا دیتے ہیں کہ وہ بالکل نیا معلوم ہونے لگتا ہے، بھرتی کے اشعار، عامیانہ خیالات، سوقیانہ مضامین، محاورات کا استعمال اور رعایتِ لفظی کا التزام جن سے اردو کے بڑے بڑے شعرا کا کلام بھی بھرا پڑا ہے اور جو خصوصیت کے ساتھ غالبؔ کے زمانے میں شاعری کا کمال سمجھے جاتے تھے اِن کی مثالیں غالب کے دیوان میں ایسی خال خال ملیں گی جو مثل نہ ہونے کے ہیں۔ مثال کے طور پر میں آپ کو ذوق اور غالبؔ کی ایک ایک غزل سناتا ہوں جو اگرچہ ایک ہی زمین میں نہیں لیکن ملتی جلتی ہیں یعنے ردیف ایک ہے اور قافیہ میں صرف یائے معروف اور یائے مجہول کا فرق ہے۔

بیت
ذوقؔ — یاں تک عدو زمانہ ہے مردِ دلیر کا　　　جھلسے ہیں منہ، شکار کئے پھر بھی شیر کا

# "جنون"

بیگم کی محبت اب تو جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ آج میں وقت سے پہلے دفتر سے نکل پڑا۔ جب گھر پہنچا بیگم ٹیلیفون کا نمبر ملا رہی تھی۔ دو، چھ، سات، چار، وغیرہ اور کچھ زیرلب گنگنا رہی تھیں ہلو...... کہاں سے۔ ہاں۔ دیکھیے چار بجنے پندرہ منٹ باقی ہیں۔ جلد آیئے گا۔ میں آپ کا سختی سے انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر پہلے باہر آپ کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھی شاید آپ آگئے۔ دوڑ کر باہر دیکھا۔ بُری طرح زک اٹھانی پڑی۔ میری اس وحشت پر نوکر منھ چھپا کر ہنسنے لگے۔ میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گئی۔ خدا جانے یہ محبت کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ آپ کو تو لطف آتا ہوگا نا۔ میری ان حرکتوں پر۔ خوب ہنسنے بھی لگے۔ ہلو۔ ہم نے ایک افسانہ بھی لکھا ہے۔ کچھ حصہ سنو گے سنیئے۔

"انھوں نے اپنی کشتی کو پانی کی لہروں میں بہا دیا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چلنے لگے۔ ریحانہ کی کالی کالی لٹیں ہوا میں لہرانے لگیں۔ سراج کی ٹائی۔ چاند آسمان پر بہہ رہا تھا۔ کائنات نور کی چاندنی میں نہا رہی تھی۔ سراج کشتی کھے رہا تھا اور ریحانہ سامنے پانی کی لہروں میں زندگی کی انتہائی مسرتوں کو ڈھونڈھ رہی تھی۔ سراج کے ہاتھ کشتی کھینے سے دکھ گئے۔ اس نے ریحانہ کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔ ریحانہ ادھر دیکھو۔ ہماری طرف۔ ہم ایک کہانی سناتے ہیں کشتی یوں ہی بہہ رہی تھی۔ ریحانہ کی انگلیاں سراج کے بالوں میں پھرنے لگیں۔ اور اس کی نظریں سامنے کے کنٹے پر جانے والے دو مرجھائے ہوئے چہروں پر تھیں۔ کالا رنگ، برہنہ جسم، کندھے پر ایک کمبل۔ ہاتھ میں ایک ڈنڈا۔ کہاں جا رہے ہیں یہ مسافر؟ ان کی زندگی کس رخ بہہ رہی ہے؟ وہ ان سوالات میں غرق تھی۔ انور نے ریحانہ کا بازو ہلاتے ہوئے کہا کس سوچ میں ہو۔ "ہاں" ریحانہ چونک اٹھی اور پوچھا "سراج ہم کہاں جا رہے ہیں"۔ "اپنی منزل کی طرف" سراج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "پسند آیا افسانہ۔ باقی گھر آکر سن لیجیے۔ دیکھیے چار بجنے پانچ منٹ باقی ہیں۔ آپ کے آنے تک میں کافی تیار رکھتی ہوں۔ جلد آیئے — ہاں! کیا کہا غلطی ہو گئی!! قہقہے لگاتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے بیگم کہیں کی تڑیا بت بنی کھڑی تھی۔ شرمائی ہوئی۔ اور ہم نے ان کو گود میں اٹھا لیا۔ انہوں نے اپنا چہرہ ہماری ٹائی میں چھپانا چاہا۔ چھوڑ دیجیے کوئی دیکھ لے گا۔ ہوں ہوں۔ روئی سنا دو باقی کہانی۔ اب تو ہم آگئے۔ گھڑی نے ٹن ٹن چار بجائے۔

سید محی الدین احمد شعلہ بی۔ اے (آنرز)

# تبصرے

(۷۰)

## ہماری درماندگی اور اس کا علاج

از جناب ظہیر احمد صاحب ایم۔ سی۔ ایس مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس صفحات

تاریخ اسلام اور مستشرقین کی بیسیوں تصانیف کے کے غائر مطالعہ کے بعد مولوی ظہیر احمد صاحب نے اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس چھوٹی سی کتاب میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مختلف زاویوں سے واضح عکس پیش کیا ہے اور بڑی بے باکی سے ان کے درخشاں ماضی اور موجودہ دور تنزل پر تنقید کرتے ہوئے دور رس اور مستقبل ساز تجاویز پیش کی ہیں۔ مصنف کے نزدیک اسلام محض ایک عقیدہ کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام صحت تخیل، عمل صالح، حُبِّ الٰہی اور نکو کاری سے عبارت ہے۔ چنانچہ انہوں نے تمہید میں لکھا ہے :۔

"اسلام محض ایک عقیدہ نہیں بلکہ وہ اس پوری زندگی کا ایک مکمل دستور ہے جو انسانوں کو اس دنیا میں گزارنی ہے۔ وہ ایک مسلک ہے۔ راستی گفتار، صحت تخیل اور عمل صالح کا جس کا مدار حب الٰہی و اخلاص نیت ادائی حقوق اور خدمت خلق پر ہے اور جس کی بنیاد تمام بندگان خدا کی اخوت اور عدل و مساوات قانونی پر ہے۔"

فاضل مصنف کی یہ تصنیف ایک شمع ہدایت ہے۔ نئی نسل کو اس کی روشنی سے کسب فیض کرنا چاہیئے خاص کر ان مغرب زدہ نوجوانوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ترقیات

جدید میں مانع و مزاحم ہے۔

**سرخ سویرا** از جناب مخدوم محی الدین ایم، اے (عثمانیہ) ۱۲۴ صفحات۔ ناشر اشاعت گھر قیمت ۱۲/؏
مخدوم حیدرآباد کے پہلے انقلابی شاعر ہیں۔ ان کا کلام ایک طرف سماج کی موجودہ کشمکش اور زندگی کی نئی قدروں کا آئینہ دار ہے تو دوسری طرف فسطائی تصور حیات کے خلاف ایک ہولناک احتجاج

خلوص، صداقت، جدت اور حقیقت پسندی مخدوم کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ شاعر زندگی کے موڑ پر کھڑا عصر حاضر کے نوجوان کو "جہان نو" کی تعمیر کا پیغام دے رہا ہے۔ سنیئے ؎

نغمے شرر فشاں ہوں اٹھا آستیں رباب مضراب بیخودی سے بجا ساز انقلاب
معمار عہد نو ہو ترا دست پر شباب باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن
ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو ایسے جہان نو کا تو پروردگار بن

**جنگ کی کہانی** از جناب افضل عابدی صفحات ۴۲ ناشر اشاعت گھر حیدرآباد قیمت ۱۰/
افضل عابدی صاحب عثمانیہ ہی کی ایک درسگاہ کے قدیم طالب علم ہیں۔ ابھی ابھی لکھنا شروع کیا ہے۔ افسانے، ڈرامے، خاکے سبھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ آرٹ کے نکات سے بخوبی واقف ہیں۔ دنیائے ادب میں بہت جلد نمایاں مقام حاصل کرلیا ہے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب شبلی بی کام اڈیٹر عالمگیر نے ان کے متعلق عالمگیر کے افسانہ نمبر ۱۹۴۲ء کے صفحہ ۱۸۸ پر بہت صحیح لکھا ہے کہ "افضل عابدی حیدرآباد دکن کے ان ذہین و فطین ادبا میں سے ہیں جن کی فن کارانہ قابلیت غیروں سے بھی خراج تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہتی"۔ مصنف نے یہ کہانی سلیس اور شگفتہ زبان میں بچوں کیلئے لکھی ہے جس میں عظیم ترین جنگ کے واقعات کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب کم پڑھے لکھے بالغوں اور عورتوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔ ضرورت ہے کہ عابدی صاحب بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھکر انکی ذہنی اور دماغی نشو و نما کیلئے چند اور ایسی کہانیاں لکھیں تاکہ ادب اطفال میں معلوماتی تصانیف کی جو کمی پائی جاتی ہے اسکی بڑی حد تک تلافی ہو سکے۔

نسیم

# جادهٔ فکر

# چلا گیا!

کل صبح حسن بزم شبانہ چلا گیا!
معصوم عاشقی کا بہانہ چلا گیا!

اب کھل گئے ہیں گنج الم ہائے روزگار
ساری مسرتوں کا خزانہ چلا گیا

باقی نہیں سکونِ دل و مرکزِ خیال
بہکی ہوئی نظر کا نشانہ چلا گیا

ملتے نہیں جنوں کو بیاباں نئے نئے
سامانِ انقلاب زمانہ چلا گیا

کیسا تلخ و دلگداز حقیقت ہے زندگی!
دلچسپ و دلفریب فسانہ چلا گیا

سکندر علی وجد
بی اے، ایچ سی ایس

# لمحاتِ فکر

نیاز و عجز میں ابھی ازار ہاہے ذوقِ سجود
مرے غرور کی کچھ انتہا ہے اے معبود

اُلجھ رہا ہے ابھی زندگی سے دامِ قیود
یقین و وہم کی یہ داستاں ہے لا محدود

ابھی ہے گرمِ سفر میرا کاروانِ وجود
ابھی حیات ہے ہر گام پر غبار آلود

ابھی جنون ہے پابندیٔ خرد کا غلام
ابھی ہیں سجدے مرے ناتمام اے معبود

حرارتوں سے ہے محروم اب بھی سازِ حیات
دبی ہوئی سی نوائیں بجھا ہوا سا سرود

یہ کائنات ابھی تک ہے کشمکش کا مقام
جنون و عقل، حیات و اجل، حجاب و نمود

یہ اختیار ہے مجبورِ اعتبار ہوں میں
بقدرِ عرصۂ ہستی ہے اعتبارِ نمود

ابھی تجھے کئی گلزار بخشنے ہوں گے
ابھی کہاں ہوئی خاموش آتشِ نمرود

صاحبزادہ میکش (عثمانیہ)

# ساقی

دیکھتا ہوں سیکڑوں کے رُخ پہ ہیں گردِ ملال
ہو رہے ہیں نشترِ غم سے ہزاروں پائمال
ہاں پریشاں ہیں سبھی دہقاں ہوں یا اہلِ کمال
میرے ساقی بادۂ گلفام لے کر کیا کروں
بیخودی کا یہ چھلکتا جام لے کر کیا کروں

بھوک، فاقہ، بے لبسی، بے چارگی، افسردگی
موت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بھی خامشی
یہ بھی کوئی زندگی ہے یا بجولا زندگی
کیسے ہو سکتا ہے کوئی اس فضا میں شادکام
ملتوی رہنے دے کچھ دن میکشی کا اہتمام

ہے وطن کی آنکھ میں کب سے ہجومِ اشکِ تر
کب سے گہری سوچ میں کھوئے ہوئے ہیں بام و در
پینے سے ہو جائیں گے سرشار کیا قلب و نظر
ساقی، مگر و ٹھہر کہ دور ہے منزل ابھی

سچ تو یہ ہے ناروا ہے عشرتِ محفل ابھی

چاندنی میں تیری باہوں کی میں سو سکتا نہیں
تیرے نغموں کی حسیں دنیا میں کھو سکتا نہیں
ہاں جدائی پر بھی تیری اب میں رو سکتا نہیں

سن کہ مستقبل کا اب کچھ اور ہی فرمان ہے
اے خوشا وقتے کہ آمد آمدِ طوفان ہے

میرے ساقی اب نئی صہبا ہو پیمانہ نیا
جوش و سرمستی نئی، آہنگ و میخانہ نیا
عیش کا عنواں نیا عشرت کا افسانہ نیا

تجھ کو دینا ہی اگر ہے تو یقیں کا جام دے
زندگیٔ نو کا کوئی آتشیں پیغام دے

محمد علی نیرؔ
ایم اے (عثمانیہ)

# حقائق

کس قدر غمناک ہے یہ زندگیٔ مختصر　　کس قدر ہمت شکن ہے زندگی کی رہگذر
کس قدر عبرت فزا انسانیت کا ہی مآل　　کس قدر ہی عکس پڑتا اس جگہ مجبور تر
کس قدر ہیں روح فرسا اور کتنے دردناک　　وہ مناظر جن کے نظارے سے کانپ اٹھے نظر
بھوک، افلاس و تباہی، بیکسی، بیچارگی　　زندگی کیا ہی کسی مفلس کی آہِ بے اثر
کس قدر تکلیف دہ ہیں رسم و آئینِ جہاں　　کس قدر صبر آزما ہے گردشِ شام و سحر
کس قدر پابندیاں ہیں حق پرستی کیلئے　　کس قدر ہیں حق و آزادی کی راہیں پر خطر
ان حقائق سے کوئی انکار کرسکتا نہیں　　کون ہی ایسا کہ جو واقف نہیں ان سے مگر
تو جو چاہے تو بدل سکتا ہے آئینِ جہاں　　ہاں بدل سکتا ہی تو یہ گردشِ شام و سحر
یہ زمانہ کیا ہے تیری زندگی کا عکس ہے　　یہ جہانِ رنگ و بو کیا ایک اعجازِ نظر
زندگانی کے مسافر گرچہ ہے منزل کٹھن　　کفر ہے مایوسیٔ دل اور توہینِ سفر
بے دلیٔ ہمرہاں کا غم نہ کر شکوہ نہ کر　　ماہ و پرویں سے پرے اپنی بنا تو رہگذر
تیرا خود ذوقِ سفر بن جائیگا منزل نشاں　　گردِ راہِ کارواں ہو جائینگے شمس و قمر

مظفر الدین ظفر محمودی (عثمانیہ)

# کون کرے

الفت کا دعویٰ ہے جھوٹا یہ جھوٹا دعویٰ کون کرے
دنیا کا تماشہ دیکھا ہے اب اپنا تماشا کون کرے

آغازِ محبت دیکھ لیا انجامِ محبت بھی معلوم
دو آنسو رونا مشکل ہے ہنسنے کی تمنا کون کرے

کھیلا تو بہت تاریکی میں ارماں کے چراغوں سے لیکن
جس گھر کے دیئے وہ گل کردیں اُس گھر میں اُجالا کون کرے

کچھ چارہ گر بھی حیراں ہیں کچھ دل کی حیرت حائل ہے
یہ درد نشانی ہے ان کی اس درد کو اچھا کون کرے

جب دنیا ساری دشمن تھی اب دنیا ساری مونس ہے
ان پر ہی بھروسہ جب نہ رہا غیروں پہ بھروسہ کون کرے

کہتے ہیں محبت میں قطبیؔ امید پہ دنیا جیتی ہے
یاں جینے کی امید نہیں امید پہ جینا کون کرے

محمود علی قطبی
بی۔ اے۔ ایل ایل، بی (عثمانیہ)

# "جشنِ بہاراں"

ہر سمت گرم محفلِ رنداں ہے آجکل
ہر ذرہ مستِ بادۂ عرفاں ہے آجکل

رشکِ بہار صحنِ گلستاں ہے آجکل
ساغر بکف ہر اک گلِ خنداں ہے آجکل

وجہ سرور کیف بہاراں ہے آجکل
ہر غنچہ اپنے حسن پہ نازاں ہے آجکل

مائل بہ عفو رحمتِ یزداں ہے آجکل
وسعت پذیر دامنِ عصیاں ہے آجکل

رنگیں فضائے عالمِ امکاں ہے آجکل
ہر برگ صد بہار بہ داماں ہے آجکل

وجد آفریں تبسّمِ گلہائے رنگ رنگ
پیغام شوق لغزشِ مستاں ہے آجکل

ہر جنبشِ نظر میں نہاں عشرتِ دوام
تسکینِ جاں جراحتِ مژگاں ہے آجکل

اوجِ فلک پہ رقص کناں ماہ و مشتری
سطحِ زمیں پہ جشنِ بہاراں ہے آجکل

اک کیف سرمدی ہے مسلّط جہان پہ
مستی حریفِ ہوش پرستاں ہے آجکل۔

رنگینیٔ بہار کا کیا ذکر اے خلش
پہلو میں میرے جانِ بہاراں ہے آجکل

از خلش (عثمانیہ)
سالِ چہارم

# میں کیوں خوش ہوں؟

کیا پوچھتے ہو، کس لئے میں آج ہوں مسرور
جذبات سے سرشار، اُمنگوں سے ہوں مخمور

انوارِ تجلّی سے ہے معمور مرا دل
سرشار مری رُوح ہے معمور مرا دل

میں اپنی حقیقت کو ذرا بھول رہا ہوں
گہوارۂ عشرت میں مگر جھُول رہا ہوں

آئیں گے نظر پھر وہی دلچسپ نظارے
سبزہ، لبِ جُو، رات کا منظر، وہ ستارے

وہ حسن کی ناگن! وہ تمناؤں کی قاتل
پھر اگلی طرح حشر اٹھانے پہ ہے مائل

وہ جس کے اشاروں پہ تڑپ جاتی ہیں بسمل
ہے جس کی فسوں کاری سے مانوس مرا دل

آج اپنے کرم سے مجھے مشکور کرے گی
تجدیدِ محبت کو وہ منظور کرے گی

عظیم حیدرآبادی (عثمانیہ)

# غزل

پروردۂ عسرت کو عشرت کی خبر کیا ہے
جو خوگرِ صحرا ہو اس کے لئے گھر کیا ہے

آوارۂ منزل ہوں منزل کے قریب آکر
مجھ سے ہی کوئی پوچھے اب لطفِ سفر کیا ہے

لے جاتا ہے جو کشتی موجوں کے تلاطم میں
اُس کشتۂ طوفاں کو ساحل کی خبر کیا ہے

ہر قطرۂ خوں میرا ہو وقفِ وطن یارب
جاں وقف کروں اپنی میرے لئے سر کیا ہے

اک آنکھ جھپکنے تک جل اُٹھتے ہیں جان و دل
کیونکر تجھے سمجھاؤں یہ برقِ نظر کیا ہے

میں ان کو مناتا ہوں وہ روٹھتے جاتے ہیں
معلوم نہیں میری الفت کا اثر کیا ہے

بزمیؔ تری حالت پر آتا ہے ترس سب کو
نادان ترا رونا یہ شام و سحر کیا ہے

احمد معین الدین بزمیؔ
بی اے (عثمانیہ)

# حیاتِ نو

جوانیوں میں ترنگ بن کر حیاتِ نو مسکرا رہی ہے
قدم قدم پر سنبھل سنبھل کر نیا سندیسہ سنا رہی ہے

جلو میں ہنگامۂ قیامت لبوں پہ حسنِ آشنا تبسم
مچل مچل کر اٹھا کے طوفاں جوانیوں کو جگا رہی ہے

نظر میں شمشیر کی چمک ہے ادا میں تلقینِ زندگانی
گھنیری زلفیں اڑا اڑا کر فضا میں آندھی اٹھا رہی ہے

خوشی میں رقصاں ہوئی تو اٹھتے ہیں چرخ پر جو افشاں بگولے
کبھی تو پیروں کے زیر و بم سے زمیں پہ دھومیں مچا رہی ہے

کبھی ہے عقل و خرد کی آندھی کبھی ہے جذبات کا ایک طوفاں
کبھی امنگوں کا بن کے دریا جوانیوں کو بہا رہی ہے

کبھی تو آہ و فغاں میں ڈھل کر کبھی محبت سے مسکرا کر
کبھی ترانے سنا سنا کر ہوا میں پرچم اڑا رہی ہے

کبھی تو بربط کے تارِ سیمیں پہ چھیڑتی ہے سرودِ عشرت
کبھی جنوں میں تڑپ تڑپ کر سنہرا خنجر ہلا رہی ہے

بگڑ بگڑ کر سنور سنور کر جبینِ آدم پہ نور بن کر
فضا میں لہرا کے سرخ آنچل وہ جانے کیا کیا سنا رہی ہے

مسلم علی سالِ اوّل

other by Dr. Mohiuddin Quadri Zore on 1st Farwardi. The various topics discussed were "Urdu as the common language of India." "The sources of original thought" and "Akber Alahabadi in Hindi."

At the second session a paper on "Ghalib" was read by Mr. Azam Khan. Mr. Quazi Abdul Gafal expressed his views on Urdu script. Through the kind help of Dr. Zore, the Union was able to get on with its work most successfully. We congratulate all the workers.

So far we have spoken about our societies. We have very reluctantly to speak about some of our societies (though we will not mention the names) that they wake up in the days of election to show that they are alive. The only sign of their work is, that they appear at election time. A French critic once said, "I speak; therefore, I exist". So also some of our Societies exist merely because they speak once a year.

G. HANUMANTH REDDI, B.A., LL.B.,
(*Final Year Class*).

PRINTED AT THE AZAM STEAM PRESS, HYDERABAD-DN.

Altogether five meetings were held :—

Mr. Satya Narayan, B.Sc. (Hon.), (Lond). Lecturer in Physics spoke on "Gravitation". Theory of relativity, "Super-conductivity." "Radio activity." "Modern Wireless" were the topics of four other debates.

An essay competition was also held under the auspices of the Union. Md. Zainulabuddin got the first and Syed Masleuddin the second prize for essays on "Gravitation." P. Parthasarathi won the first prize "On the services of Electricity" We congratulate them all.

## THE HISTORY UNION.

*President :* ... Mr. Faseeuddin Ahmad.
*Vice-President :* ... Mr. Khursheed Ali Khan.
*Secretary :* ... Mr. Maquddar Ali Shareef.
*Joint Secretary:* ... Mr. Asaf Ali Khan.

Debates were conducted both in English and Urdu. Professor Hussain Ali Mirza and Dr. Yousuf Husain Khan delivered very interesting speeches. The hall was overcrowded at these lectures. The students went to Bidar for two days on historical excursion.

## URDU ASSOCIATION.

*President :* ... Mr. Sayed Rajid Ali.
*Vice-President :* ... Mr. Md. Sahmsuddin.
*Secretary :* ... Mr. Masleuddin.

Under the auspices of the Union, two sessions of the Urdu conference were held the first on 30 Isfandar, presided over by Sir Mehdi Yar Jung Bhadur, and the

We congratulate the young writers. We also congratulate the President and Secretary who took a keen interest and made it a perfect success.

### THE PERSIAN LITERARY SOCIETY.

*President :* ... Mr. Syed Fazlur Rahman Sayeed.

*Vice-President :* ... Mr. Habeebuddin Ahmad Naisan.

*Secretary :* ... Mr. Said Naiemuddin Ahmed.

The installation meeting of the Society was held under the Chairmanship of Mr. Qazi Mohammad Hussain, Syed Fazlur Rahman delivered his presidential address and after the inspiring speech of Dr. Nizamuddin, on "The Latest Iranian Publications" the meeting came to an end.

Professor Hosain Alikhan, Head of the Department of English, delivered an interesting lecture on "Some translators of the Quatrains of Omar Khayyam."

The Society also invited Mr. M. M. Hidjazi, who delivered an excellent lecture on "Modern Literary trends in Persian."

Under the guidance and inspired by the personal interest of Dr. M. Nizamuddin the society is working on systematic lines.

### THE PHYSICS UNION.

*President :* ... Prof. Wahidur Rahman.

*Vice-President :* ... Mr. Abdul Hadi,

*Secretary :* .... Mr. Md. Zainulabuddin.

## College News.

WITH this issue our tenure of office comes to a close. How far the standard of our Magazine has been raised or maintained, you will be the best judges.

This year has been almost unique in the number of opportunities it has given us of meeting distinguished personalities from outside the state. Sir S. Radhakrishnan and Pandit Amarnath Jha paid us visits and delivered illuminating speeches.

At its last Convocation the University conferred the honorary doctorate upon an eminent man, C. Rajagopalachari. In honouring him we have honoured ourselves and have made his ties with our institution inseparable.

### THE ECONOMICS UNION.

The days of the election were the most stormy, but out of that election storm the following were lucky enough to servive.

| | | |
|---|---|---|
| *President :* | ... | Mr. Abid Hussain Razvi. |
| *Vice-President :* | ... | Mr. Safiqul Rahman. |
| *Secretary :* | ... | Mr. K. R. Narsa Reddi. |
| *Librarian :* | ... | Mr. G. Narayanswamy. |

The most remarkable achievement of this Union is the publication of four pamphlets by its own students under the able guidance of Dr. Anwar Iqbal Qureshi.

the gigantic bodies, their inter-stellar spaces, transpatial systems, see how beautiful we have made it! We have realised that moral order of which Kant spoke, which is as beautiful as the stars in the sky."

The professor had hardly finished when innumerable flashes darted into the sky, till all these flashes of multi-coloured light formed a luminous halo above, consisting of all colours from infra-red to ultra-violet both made visible to the spectators below, creating a sort of aurora borealis. The band was playing Beethoven's great symphony and it seemed as if the notes of music were mingling with the rays of light thus creating a harmony that was sublime.

"How gorgeous!" said she.

"Yes," said the professor "this is art—the living principle".

KAUKAB DURRY, LL.B.,
*(Previous Class).*

———

"By making life and not wealth the standard of our values."

"That explains my problem" said he.

"Yes," said the professor "that explains why there was so much of frustration then, inspite of the advance of technology. That is just the difference between the Artistic and the Western civilisations. There was repression, neurosis, and anxiety in the past while there is freedom and self-expression now."

"And how did we discover our civilisation?" said he.

"Through art. A group of artists got together in the last century and started to look for life and truth in the multifarious activities of that age. They were men of feeling and through this feeling—pattern worked out a new philosophy of life. They tested their hypothesis by bringing it into contact with reality. It then began to be understood that art, that sublime expression of the human soul should be the basis of a new world order. It consequently become the living faith."

The night had come, the river flowed silently and innumerable stars glowed in the sky. The villagers had gathered around the band whose meledious tunes were being wafted beyond by the cool breeze that blew.

"What a small place this," said the professor as he looked at the sky. "There are stars a hundred times bigger than the earth and as many as the grains of sand on all the sea shores of the world, and yet the Universe is lifeless. In spite of our smallness as compared with

crises, why the race in armaments, why guns instead of butter, why dictatorships, Fascist bogies, race superiorites and the like? If you examine it closely, exploitation was the essence of that age. Man was not valued for what he was but for what he had. That sublime harmony between the individual and society Western Civilisation failed to provide. Routine, and regularity had chilled the artistic impulse and nourished only the baser instincts of mankind which we have utterly destroyed."

"But what about their morality, Professor" she said, "surely you don't assert that they were devoid of moral or spiritual values".

"Even the Fascist had a morality of their own" the professor continued, "if by morality you mean certain forms of behaviour approved by public opinion. But if you mean the reign of those values that are eternal, I am afraid there was not much of them. Twentieth Century morality or conventional morality, as some cynics called it then, did not elevate the soul or refine the brutal instincts of man. Sex was the subject on which it concentrated and sex it degraded by its dogmatism. We lead purer lives sexually than they did—why? because sex is not taboo with us. We hardly marry more than once in our lives, for we regard a life-long attachment and friendship of greater importance than sex."

A little girl brought refreshments and laid them on the grass (for they were sitting on the turf) and with a little bow went away.

"But how did we jump to this" said the young man.

"Yes" said the professor "it does seem strange. A hundred years ago the world was in the midst of a world war. World War II, they called it, and how silly, as if it was somthing of which the world may be proud."

"But how came this war in spite of the unity of the Western civilization?" asked the young man.

"I think because the different elements of that civilization became self-conscious and there was no sustaining principle to hold them together" she said.

"I dont quite think so," said the professor; "there was something essentially destructive about that civilization."

"I think it a wrong principle" said the young man "to assess the merits of a past civilization in terms of present values."

"In a minute the sun will go down" said the professor, looking at the crimsoning horizon "and soon we would be left to the darkness and the stars. The landscape is indeed idyllic." "Yes" said the professor waking up from his artistic trance. "I mean no. There is no doubt that the social and economic conditions of the last century, thanks to the progress of technology, had attained a level, where the happiness; of the people, at least in the rudimentary form we now enjoy, was definitely possible."

"It was not the social conditions of the people that did not permit of happiness, there was a gross maladjustment of society that was all. Why the frequent economic

## In the Realms of Art.

"YES" said he, as he turned from the embankment where the glittering river lay, "yes, I find it difficult to believe that an age rich as theirs, with all the luxuries that science could provide was full of frustration and gloom."

"It was a historical necessity" she said, "all that unhappiness was but the complement of that age".

"How faithfully Hegelian, pooh."

"Why, are you leaving so soon? Here comes the professor of art, let's meet him."

It was an annual day of that village (November 6, 2044) and all the people had gathered on the river side to celebrate the occasion. The scene was happines materialised. The green turf of the river side exhaled freshness while the place blossomed with flowers of all shades and perfumes. The inhabitants of the village mostly artists came in multi-coloured clothes of dazzling brilliance. Light refreshments were the sole care of pretty girls of the village, who smiled as they served and served as they blushed. And they harmonized well with the scene around: the velvet turf, the sunset and the melodious strains from the village band.

The professor of Art sat down.

"We were just discussing the conditions, Professor," she said "of the 20th century, and it seemed so strange."

# Departure of Wild Duck to a Warmer Clime.

'Twas early morn ; the lake lay dull and grey
'Neath th' wintry sky. The fading stars were hid
Behind grey clouds now tinged a rosy red,
As the blushing East acknowledged a new day.
The smooth face of the lake was not yet lined
With wrinkles, cares, and worries of the wind ;
Upon its breast, near patches of dark weeds
Befeathered, huddled groups of duck were seen.
The sun rose, chasing mist-wraithes across fields ;
It gilded all the marshy land around,
And lightened shadows cast by gloomy trees.
Its golden rays awoke the duck,; and soon
Desult'ry quacking filled the air as birds
Called to their mates and kin to join the feast
Of luscious tit-bits in the dark green weeds.
Some preened themselves, and others, flapping wings.
Skimmed calm grey gaps between them and their feed.
Then harsh cries sounded loud. The older birds,
Which felt the urge so strong to be away,
Called to the rest. They had so far to go
Ere they could rest, as Nature had ordained,
To spend the Winter in a milder clime.
The largest took the lead. Its flapping wings
Thrashed white the grey, calm lake. It urged the rest
To flight. Some others beat their wings; and soon,
Just as the rosy sun turned gold, the last
Were in the air, circling round. Away,
Beyond the limits of the marsh, the first
Were tiny specks. A gentle morning breeze
Passed through the rushes round the lake. They bowed
And nodded "Au Revoir". The faint, faint calls
Of duck grew still. Their straining wings
Bore onwards—to the Warm and Sunny South.

V. K. REDDY.

Germany even though it may be only in the form of a state susceptible of military development, as an attack on Germany and think it not alone a right but a duty to prevent such a State from arising, or to smash it if it has arisen, by every means, including armed force."

(*Mein Kampf*. 5th edition, pp. 754–55).

In such a doctrine, inculcated upon the German people in Hitler's autobiography *Mein Kampf*, the Nazi Bible, of which millions of copies have been sold, lies the potent cause of this war. It serves as a challenge to those opponents of war who think that a Sovereign State is bound to subordinate the exercise of its sovereignity to the fulfilment of its obligations as a member of a commonwealth or community of nations.

TAHIR HAMID,
*III Year Arts.*

---

leads to blind fury and destruction and is absolutely deaf to any rational arguments and the economic repercussions of their actions.

## THE REAL ENEMY.

One of the chief causes of war is the blind OBEDIENCE to the State.

The German philosopher, Hegel who was a progenitor of Marxism, Fascism and Nazism alike in his *Philosophy of History* says: "The State is the divine will as the present spirit unfolding itself in the actual shape and organisation of a world. It is absolute power on earth. It is an end in itself. It is the ultimate end which has the highest right against the individual, whose highest duty is to be a member of the State."

This theory is identical with the doctrines proclaimed by Italian Fascism and German Nazism. The The Hegelian, and the Hitlerite, doctrines imply that individual States must struggle and fight until the strongest imposes its will upon others. These philosophies about the State are more political than economic. According to Hitler their doctrine implies:

> "The victory sword ruling race bending the world to the surface of higher *kultur.*"

Hitler has further observed in *Mein Kampf :*

> "Never allow two continental powers in Europe to arise. Look upon every attempt to organise a second military power on the frontiers of

national spirit is doomed. In relations between states it is war that ultimately decides. I have defined war as the "Supreme Court of Peoples." It is that, indeed, because victory and defeat are the factors which determine the hierarchies of States. Its judgement is final. Appeal can be but to another war." Herr Hitler's *Mein Kampf*, too, breathes the spirit of war. Nowhere in Europe was the cause of war so ardently advocated as in Germany where Chairs of Military Science were created in German high schools and universities, and even before the last Great War, military science occupied a very prominent position in Germany and a tremendous amount of literature was being produced in that country glorifying war. For example Schiller in *The Bride of Messina* writes:

> "Man is stunned by peaceful days,
> In idle repose his courage decays.
> Law is the weakling's game,
> Law makes the world the same.
> But in War man's strength is seen,
> War ennobles all that is mean;
> Even the coward belies his name."

Noblest among the emotions that make for war is the compound love of pride and self sacrifice that goes by the name of patriotism. No source of ecstasy is more generous than this, and on the whole none is purer. But when this great power is stirred to satisfy the whims of war-mongers and egoistic dictators, this very spirit

# The Political Causes of War.

THE causes of war are numerous and complex, but these may be reduced to two main categories: political and economic. In the following lines we shall try to examine the political causes of war.

In the very first place it should be noted that the political causes of war are much more important than the economic causes. When a person is filled with a spirit of national pride, racial superiority and the blind love of his "fatherland", and is spurred to action by incessant and violent propaganda which is ceaselessly carried on by the strong mouth-pieces of the State, there is no end to which a person or a nation would be prepared to go regardless of consequences. This was exactly the state of affairs which prevailed long before the war in many countries of Europe where people were made to believe that war was something grand and golden.

### GLORIFICATION OF WAR

(Modern Ideology).

Signor Mussolini, writing in a widely published newspaper in October 1934, under the title "*Why I prepare for war*" observed, "The most sublime act of faith a man can achieve is that of sacrificing his own life for the sake of national collectivity. A people without a

appropriate words and rhymes. But he steered his ship through unfathomed waters and reached the shore all alone. His poetry is composed of the melody of music and the noise of the battle-field. Nazrul Islam never tried to live for tomorrow, he in fact is indifferent to it. He reflects the spirit of the age. He himself says, "I do not care if posterity will read me or neglect me. I only want to make my poetry the death companion of four hundred million people who are every day being tortured to death by alien forces".

MOHAMAD HAMID MOHIUDDIN,
*IV Year Class.*

---

The intellectual Renaissance in India is marked by three important phases of development. Tagore tries to seek consolation in Mother Nature; while Iqbal presents this problem in a different form. He takes the inequality of man for granted. He calls capitalism a curse on modern society but he wants to find out a method by which the rich and the poor, the proletariat and the bourgeoise, the 'haves' and the 'have-nots' can live together in harmony and peace. Nazrul Islam with his singular boldness brushes aside every thing that tends to the exploitation of the poor by the rich. He is a fanatic exponent of socialism and calls it the only remedy of all evils. These three poets represent three schools of thought in India, the future alone will decide, which of them India will select as its guide.

Another thing distinguishes Nazrul Islam from Tagore and Iqbal. Tagore has borrowed most of his philosophy from the writings of Kabeerdas and many other Bengali poets. He has presented the old philosophy in a new garb; Iqbal was profundly influenced by Nietzche and Bergson. When he returned from Berlin the theory of the Superman was in vogue, and Iqbal has presented it in his own way. Nazrul Islam imitated no one, he was not learned nor did he understand the philosophy of his age. In such circumstances he had to rely only on his natural talents.

He broke all fetters, all the literary conventions. In the language of his province, he could not find out

Then again in 'Woman' he says:—

> "I look upon men and women as equals.
>
> In the dignity and grace of this world woman has played an equally important part with man.
>
> History can show us how much blood was shed by men but who will explain how many women have agreed to become widows?
>
> How many mothers have given away their sons from their side?"

His Romantic poetry compares favourably with that of the best of the Romantics in English literature and Urdu. In his poem, 'You will remember", he says:—

> "You will remember me, when I will be no more in this paltry world.
>
> You will remember me when Jasmine will fall and spread like white bed-sheet in your court-yard.
>
> And when you will prepare a garland, your bangles will quiver and the withered buds will begin to weep silently.
>
> You will realise that every particle of the dust of my grave is lamenting and afflicted leaves of the tree are nurturing it with dew."

There are many other poems which we are unable to include or to quote. It will be clear from a mere perusal of these lines that Nazrul Islam is first and last a revolutionary genius.

I am a born rebel, cruel, the companion of death, storm and destruction. For the world I am a personification of destruction"

"I am a rebel—my head will always be high."

"I am the storm, terror, pestilence and universal danger."

"I keep in one hand a melodious flute and in the other a trumpet of war."

"When I laugh after bathing in the fire of hell my mouth sheds flowers."

"I am perishable, everlasting, eternal, unending—that unity which is above all duality."

"I will be tranquil only when my lament echoes in the ear of God."

In his sympathy for labourers and workers Nazrul Islam excels even Marx and Lenin. He says:

> "On a certain day I saw a 'Babu' knocking down a Coolie.
>
> I was moved and tears began to flow from my eyes.
>
> Will the weak always remain in this unhappy position"?

Addressing the rich he says:—

> "Your palaces and halls are sprinkled with the blood of the poor. On every brick of the walls his story of woe is inscribed. Every particle of mud knows your dignity and fame."

The end of the last war saw him in the heart of the famous Khilafat movement, and the publication of his poem, 'Agmani' deprived him of the Hawaldari. Often he went to prison, but every time he came out with a new collection of poems and the Government of Bengal was forced to confiscate and give to the flames, six of his collections. It is said that in the absence of ink and paper, the Qazi scattered his inspiring poems on the prison walls; all inscribed in his own blood. It is a melancholy fact that these have disappeared once for all from the sight of the world. This 'Bard of Indian Revolution' as so many European critics called him, had set the ball rolling. Already his first poem 'Agmani' had made him the most famous and the most popular poet in Bengal. He now proceeded to write his second poem. He named it a 'Rebel' (Bagi). It was first read before a literary circle in Bengal of which the President was the late Rabindranath Tagore. Few could expect a man of his position and circumstances to rise to such a great height of intellectual sublimity and moral enlightenment. Every line of his poem proved a cleansing whirlwind in a Bengal rotting with delusion. Never had a soldier spoken so lyrically. His style is powerful, the language is supple and vigorous and exhilarating. He offers us not only poems but a new faith, a new hope, and a new religion.

While it is difficult to translate the fascinating poem in all its charm, we shall endeavour to give our readers some extracts. Says our poet in 'Rebel'. "Speak, Oh Youth! I am head and shoulders above the rest—so high that even the Himalayan heights are under my feet." "Speak oh brave! I will keep my head always high,

## The Rebel Poet of Bengal.

THE political history of Bengal has always displayed notable sectarian tendencies by rebellions and attempts at separation from the Indian Union. The fact is that a Bengali is first and last a super-patriot and an ultra-nationalist. Rightly or wrongly these sentiments have kept the flame of liberty burning in his heart and very often actuated him to many revolutionary upheavals. Many poets and writers during this period have given vent to their feelings and Quazi Nazrul Islam occupies that most significant place amongst them.

The life of this rebel poet is a study in revolution. Born in the nineties of the last century a destitute, he took to staying out, frolicking with the riosterers of the town. His education was scanty and we see him recruited to the army at the outbreak of the last war of 1914.

One day fighting in the trenches, he was exhausted and the night saw him restless and sleepless. Amidst the 'sleeping dogs', the boom of guns and the shrieks of the wounded he alone was awake. His body was aching and so was his soul. With a supreme effort he gathered together the different threads, and what his mind could not account for, his pen began all of a sudden to inscribe on the paper in the darkness of the night. And lo! in the morning it was a complete poem, a true masterpiece. A local daily in which this masterpiece was printed, sold forty thousand copies that day. Like Lord Byron the Qazi could exclaim, 'I awoke one morning and found myself famous".

life we are all Philosophers on a small scale. But Philosophers too are men, they too weep. But still to allay the after-effects of grief, Philosophy acts as a magic balm.

Friendship is a noble thing. The great philosophers of yore gave this advice to all to cultivate as many friends us possible. It is true that the darker aspects of a friend we bury and the good we always remember as the poet has sung:—

'For truly when a man shall end,
He lives in the memory of his friend
Who doth his better part recall
And of his fault makes funeral'.

S. MURTHY,
*IV Year Class*.

---

death instead of 'halving our sorrow', they double our grief. They leave us in perpetual agony to mourn their memory.

It is amazing how a life ends so suddenly. We daily meet our friend, talk to him, laugh with him, and walk with him; but the next day we are deprived of his company, for he is ill. After two or three days we hear his death pronounced solemnly. It becomes almost impossible to believe his death, because so long an association has killed our sensation for this kind of bereavement we often delude ourselves and hope that he is not dead. Sometimes to escape the rigour of our calamity we think that he has gone to some far-off place, but all to no avail. We are at once conscious of the reality behind this sham supposition. Tears well in our eyes. We begin to remember his little frailties and fancies, we smile a doleful smile, we remember how he twirled his moustache, and was proud of it and many such other things. Till at last, we can contain no more, we break out into tears and weep profusely. We are men and the intensity of our grief finds consolation in our giving free vent to tears.

Poets have died when young. And how oft have we not heard of the Candle of Good men being put out in the summer of their life. It is a great pity that all their great thoughts and high ideals are denied to posterity by their untimely demise. Death in the early twenties is too heartless and cruel. It is a great pity to see "that youth's sweet-scented manuscript should close."

We must always be thankful to Philosophy for its consolations, in times of dire necessity. In our normal

# Friendship and Remembrance.

REMEMBRANCE would cause grief to anybody. A poor man grieves over the death of his kith and kin, a rich man mourns the memory of his relatives and friends. The verdict of mortality is stamped upon every one of us. Friends and relations die, but one thing lives for ever and it is always as fresh, as the first flower of spring. It is Memory. The memory of our dead lives, as long as we have life in this corporeal frame. You may ask yourself. 'Why do we remember our dead?' or 'What is the quality in them which makes them live in our memory?'. It must be either their noble personality or their unblemished character or the most important thing, associations, our favourite haunts always have associations with our dead friend. All at once our memory rushes back to us. To remember a dead friend is painful, but we human beings are so constituted, that we always forget the thing, which we would wish to remember, and always remember the things which we would prefer to forget.

As I said it is association with the dead friend which awakes memory. We remember him so frequently that it becomes an obsession. True it is that we are healed of this wound, in course of time, not because our love for our friend grows less but because the healing quality in time is more.

It is said that 'friends double our joy'. Indeed they do, but they do it as long as they live but after their

In Paris he went to see his tragedy *Irene* performed. The people knew he was coming, and lined the streets to get a glimpse of him. In the theatre itself voices became hoarse with shouting as he entered, "Long Live Voltaire!" "Hail to the defender of Calas! Hail to the Universal man!"

That was on 30th March and it was the last time that Paris saw him. For he died exactly two months later, 30th May 1778. The church refused him orthodox burial, but his friends took the body into one of the provinces and wangled permission for burial there. Twelve years later, after the Revolution broke out, his remains were brought in a triumphant procession into Paris for burial in the Pantheon. On the sacrophagus were inscribed the words:

"As poet, thinker, and historian he gave the human spirit a great inspiration. He prepared us for freedom."

But after the restoration of monarchy, 24 years later, his bones were again taken away from the Pantheon, as a sort of revenge, and thrown nobody knows where.

The monarchy and the clergy took their revenge not on the living but on the dead Voltaire, but wherever his tomb, the only epitaph necessary are the three words:

*Ave Atque Vale:* hail to thee and farewell.

SHAHID ALI KHAN,
B.A., *(Osmania)*.

---

did he believe in the efficacy of a revolution. Conservative in thought, he did not trust the populace. "When the people undertake to reason all is lost" (Voltaire). Does it not seem strange that a man who was the cause of a revolution disowns it as a remedy?

He could not see eye to eye with Rousseau. When the latter sent Voltaire his *Discourses on the Origin of Equality*, he received the reply, "I have received, Sir, your new book against the human species, and I thank you for it............No one has ever been so witty as you are in trying to turn us into brutes; to read your book makes one long to go on all fours. As, however, it is now some sixty years since I gave up the practice, I feel that it is unfortunately impossible for me to resume it."

At 83, Voltaire decided to go to Paris. The doctors forbade him from undertaking such a long and arduous journey. But he had decided. A coach halted at the Customs office outside Paris; the officials wanted to know if there was anything in the carriage that was prohibited. "I don't think, gentlemen," came a voice from within, "that there is any contraband here except myself." Upon hearing this one of the officials looked in, and quite startled, exclaimed, "By heavens, it is M. de Voltaire!".

And so he was back in Paris. Apparently he had come to help in the staging of one of his latest tragedies —*Irene*. But that was only an excuse; beneath it all lay one great desire—to have a last glance at Paris, the Paris that he loved to see, and the Paris that loved to see him. The next day his residence was filled with over 300 visitors. Benjamin Franklin brought his grandson for Voltaire's blessings; and Voltaire stretching out his hand bade him dedicate himself to "God and Liberty".

"The first divine", said he, "was the first rogue who met the first fool", and later wrote, "Men fed by your labours in a comfortable idleness, enriched by your sweat and your misery, struggled for partisans and slaves; they inspired you with a destructive fanaticism, that they might be your masters; they made you superstitious not that you might fear God, but that you might fear them." In the *Oedipe* he wrote:

"Our priests are not what simple folks suppose;
Their learning is but our credulity."[1]

Thus he tirelessly produced the pamphlets which confirmed him as the greatest journalist the world has ever known. It is difficult to realise what an enormous hold he had on public opinion through his pamphlets which he wrote all on the same theme, but in a thousand different ways, a thousand different times. "Big books," he said, "are out of fashion". And so, as Will Durant puts it, "he sent forth his little soldiers, week after week, month after month, resolute and tireless, surprising the world with the fertility of his thought and the magnificent energy of his seventy years".[2]

Voltaire was not an atheist. He was a staunch believer in God. His philosophy is an agnosticism tempered by a deism. In political thought he was a conservative. However he had already warned us, "Politics is not my line," and told us, "I am tired of all these people who govern states from the recesses of their garrets,...............unable to govern their wives or their households they take great pleasure in regulating the universe." He did not believe in narrow patriotism, nor

1. Act IV. Sc. I. 2. Story of Philosophy P. 260.

orthodoxy. This started with the famous Calas case in 1762. The son of Calas—a protestant shopkeeper of Toulouse, committed suicide. A false rumour made out that the son wished to become a Catholic and so the father had murdered him. On this false charge the Calas family was exiled and the poor father was put to death. "The executioner shattered the bones of his limbs and chest with blows of an iron bar. Then he was bound to a wheel, to die slowly, and then burnt."[1]

The family sought refuge at Ferney and the shocked Voltaire started a relentless war against orthodoxy of this kind. Two similar cases—that of Elizabeth Sirvens and the other that of La Barre, confirmed Voltaire in his crusade. He changed his attitude, and became a thoroughly serious man, laying bare in small pamphlets the notorious abuses of the church and ended each with his famous motto, *Ecrasez l'infame*, which he now adopted. He stirred and awakened France and began to pour forth such intellectual fire that sceptres tumbled, the clergy lost their power, and finally came the big crash—the Revolution Francaise.

In his treatise on toleration, Voltaire says that he would have been able to bear all the absurdities of orthodoxy if only the priests had practised what they preached—toleration. But says he, "Subtleties of which not a trace can be found in the Gospels are the source of the bloody quarrels of Christian history." Again he says, "The man who says to me, 'Believe as I do, or God will damn you,' will presently say, 'Believe as I do, or I shall assassinate you'." And then he asks, "By what right could a being created free force another to think like himself?"

1. Voltaire by Andre Maurois P. 122.

"Miscreants!" cried the indignant Sirian, "I have a good mind to take two or three steps, and trample the whole nest of such ridiculous assassins under my feet."

"Don't give yourself the trouble", replied the philosopher, "they are industrious enough in securing their own destruction...........Besides, the punishment should be inflicted not upon them, but upon those sedentary and slothful barbarians who, from their palaces give orders for murdering a million men, and then solemnly thank God for their success."(1)

Even more interesting is Voltaire's *Zadig*. His *Jeannot and Colin* is a delightful satire on the wealthy. The Marquis discusses with the governor of his son about the latter's education. Should he be taught Geography? "Of what use will that be?" answers the governor, "When the Marquis goes to the estate, won't the postillion know the roads?"(2) In a like manner all branches of learning are set aside and the enlightened father concludes. "A man of quality like the young Marquis should not rack his brains with useless sciences."(3)

Voltaire's other famous works are his *Philosophy of History* and *the Ignorant Philopoher*. In his *The Good Brahmin* he shows the inner struggle and doubts that find their way into the mind of a man of knowledge.

But by far the most voluminous and the most noble of his works started at Ferney, with Voltaire's slogan "*Ecrasez l'infame*"—"crush the infamy"—the infamy of superstition, which appeared under the garb of

1. Ibid. P. 242. 2. Ibid. P. 286.
3. Ibid. P. 287.

a farmer near Constantinople. Pangloss's philosophy is compared with that of another character in the story—Martin, the pessimist. Martin, like Voltaire, hates the idea of wars and of the destruction of the achievement of centuries in order to satisfy an unforeseen surge of the spleen. "Have you ever been in France, Mr. Martin?" asks Candide. "Yes", says Martin, "I have travelled over several of its provinces. In some, half the inhabitants are mere fools; in others they are too cunning;.........in others, they affect to be wits; and in all of them the chief occupation is love, the next lying, and the third, to talk nonsense."(1) In this conversation we get a foretaste of Voltaire's disgust with men, with France, with the world. And the story ends with Candide's remark, "Let us cultivate our garden." That is Voltaire's message. Let us not talk big, but do in our own small way the little good that we can do, and the world would be the happier for it.

In his *Micromegas*, Voltaire imitates Swift's *Gulliver's Travels*. Micromegas, the inhabitant of Sirius visits the earth. He is 500,000 feet tall. Walking through the Mediterranean he wets his heels, and takes a ship as it passes, and balances it on his thumb-nail. He then addresses the passengers of the ship. A philosopher from the ship answers him, and says that there is a war going on in which men on this earth are killing fellow-men. Upon inquiring into the cause of this struggle he "was given to understand that the subject of dispute was a pitiful molehill (called Palestine) no larger than his heel."(2)

1. Ibid. P. 159. 2. Ibid. P. 242.

During his life at Ferney, Voltaire had turned, if anything, a shade more bitter. He was disgusted with this world of cant and hypocricy. In Lisbon in November 1755, there occured a terrible earthquake in which 30,000 souls lost their lives. It was, incidentally, All Saints' Day, and most of the people were crushed while praying in the churches. The French priests attributed this to the sin of the people of Lisbon! It was shocking—this attitude. It was sheer callousness to suffering. The grieved Voltaire turned to verse to express his emotions:

> "Silence; the book of fate is closed to us.
> Man is a stranger to his own research;
> He knows not whence he comes, nor whither goes.
> . . . . . . . . . . . . . . . . . .
> . . . . . . . . . . . . . . . . . ;
> This world, this theatre of pride and wrong,
> Swarms with sick fools who talk of happiness."

And now let us turn to his works, *Candide* perhaps the best short-story in literature. Candide, the nephew of the Baron of Thunder-ten-tronchk, falls in love with the Baron's daughter Cunegonde, who "aged about seventeen years, was of a ruddy complexion, fresh, plump, and well calculated to excite the passions."(1) For his love for her he is kicked by the Baron out of his house. His teacher, the Philosopher-optimist Pangloss taught metaphysico-theologo-cosmolonigology! Pangloss was an optmist and believed that everything was for the best in this best of all possible worlds. However in spite of this Candide gets kicked out, is captured by the invading Bulgarians, escapes to Lisbon, gets caught up in the earthquake goes to Paraguay, and finally settles down as

1. Best Works of Voltaire (Blue Ribbon Books.) P. 121.

At Ferney he started gardening, agriculture, and industries. Silk stockings for the beautiful ladies of Europe, laces of all kinds, and watches poured forth in large numbers from Ferney. He recommended his reliable watches to his friends all over Europe. In Ferney lived Genevese and French, Protestants and Catholics, in an atmosphere of marvellous religious toleration. Small houses were built for labourers, and the whole place was like one happy family. "I have left abundance", wrote Voltaire himself, "where there was want before. True, only by ruining myself, but a man could not ruin himself in a more decent cause."

Here he wrote plays, pamphlets, poems, and letters. And here it was that he entertained the best of European society. Those who could come, came to taste of his wine and wit; those who could not, wrote to him. Letters and visitors swarmed in from all over Europe. Gibbon and Boswell came from England, came to Ferney and its king. Catherine II of Russia wrote frequently; and even Frederick resumed correspondence after five years' silence. It was a "lovers' quarrel", exclaimed Voltaire. "You have done me great wrongs", wrote Frederick, "I have forgiven them all, and I even wish to forget them. But if you had not to do with a madman in love with your noble genius, you would not have gotten off so well...........I esteem in you the finest genius that the ages have borne; I admire your poetry, I love your prose." France was at war with Prussia, but their correspondence continued; only it became more cordial, more frank, less bitter, and full of mutual admiration; and, even after Voltaire's death, Frederick never forgot him. He said, "I say a prayer to him every morning. Divine Voltaire, I say, pray for us".

express orders of Frederick, brought about ill-feeling between them. This increased, and Voltaire on top of this had once remarked about the king's sending him his verses for correction, "Will he never be tired of sending me his dirty linen to launder?". Frederick on his part said, "I shall want him at most another year; one squeezes the orange and throws away the rind." Later on in a mathematical controversy, Voltaire took a stand against Maupertius, a French mathematician of Frederick's court. The king sided with Maupertius in the controversy. "Unluckily for me", worte Voltaire to a friend, "I am also an author, and in the opposite camp to the king. I have no sceptre, but I have a pen", and a pen about which Anatole France wrote. "In Voltaire's fingers the pen runs and laughs." This most dangerous of all weapons, his scorn, he used against Maupertius, in the famous *Diatribe of Dr. Akakia.* He read it out to Frederick and Frederick not being able to control himself burst out into laughter. It was delightful. But the king did not want it published, and Voltaire had it printed. Frederick flew into a rage, and Voltaire fled from Potsdam.

While on the borders of France, he was told that the French king did not want him—he had been exiled from France. And so he went depressed, disgusted, and disillusioned, to find himself a quiet home on the French-Swiss border. Near Geneva he bought an estate to which he gave the name of Les Delices(1)—a name as musical as could be. Later he bought another estate not far from the first—Ferney, and it was here that he finally settled down for the next twenty years.

---

1. Les Delices :—It was orginally called Sur Saint Jean. See "Voltaire" by Andre Maurois. P. 90

Later Madame du Chatelet was to have a child. She confessed it to Voltaire, and Voltaire remarked: "We will simply include the child in Madame's miscellaneous works"! But Mme. du Chatelet died in childbirth. The grieved Voltaire going down the Chateau stairs slipped and fell. His rival rushed and picked him up. On gaining consciousness Voltaire remarked, "Oh, my young friend, it was you who killed her for me!"

Meanwhile Frederick the Great of Prussia had begun his correspondence with Voltaire in 1736, and since then had been eager to get Voltaire over to Potsdam, but Mme. du Chatelet had been in the way. Voltaire preferred his mistress to all the laurels that Frederick had to offer. "Do not suppose", wrote Frederick, "that I push my scepticism to extremities: I believe, for instance, that there is only one God and only one Voltaire in the world." And again, "I count it one of the greatest honours of my life to be born a contemporary of a man of such distinguished attainments as yours."

But tired of inviting Voltaire, the Prussian king had attached to his court a French poet d'Arnaud Baculard, to whom the king wrote:

"The French Apollo sinks in slow decline:
Come hither, Arnaud, rise theyself, and shine!"

These lines were enough to inspire Voltaire. The divine Emilie too had died, and so Voltaire, heart-broken and solitary, decided to go, to go to Frederick at Potsdam. There he was given a right royal reception, and enjoyed his long talks with the king, and for a moment believed that all would be well. But Voltaire's love of speculation, and his investing money in Saxon bonds against the

her cousin Emilie had conquered the greatest man of the age, the favourite of kings and queens, and the idol of French literature. However..................

Madame du Chatelet was very-well read and had translated Newton's *Principia.* She and Voltaire worked incessantly in the laboratory at Cirey, each trying to do more than the other. In the evening they met their innumerable guests whom Voltaire entertained with his poems and plays. Cirey thus became for a time, the intellectual capital of France. Here Voltaire devoted himself to literature, chemistry, mathematics, history, astronomy, philosophy,—and love, and in all these studies he progressed quite far.

In 1746 Voltaire was elected to the French Academy, and his address composed for the occasion is one of the classics of French literature. But suddenly a tragedy occured. Mme. du Chatelet fell in love with a handsome young man—M. de Saint Lambert, and Voltaire once entering her room unannounced, found her very intimately seated with the young man. Voltaire was wild, and threatened tc leave the place the same night, but "his valet, in the interests of a reconciliation sees to it that the coach is unavailable."(1) There was a patch up later on. Lambert himself came to apologize, whereupon Voltaire's tender heart melted: "My boy", said he, "I have forgotten everything, and it is I who am wrong. You are in the happy age when a man loves and takes pleasure. Enjoy those moments—they are too brief" A stanza on the episode followed:

"Saint-Lambert, it is all for thee
The flower grows;
The rose's thorns are all for me;
For thee the rose."

1. Emil Ludwig: Genius and Character. P. 210.

Returning to France in 1729, he began investing money in business, and succeeded in these and also in lotteries. Two passions always filled his thoughts—money and literature. He always believed that one should live before one could philosophize.

In 1731 came exile again. A famous French actress, Mlle. Lecouvreur, died and was refused orthodox burial merely because she was an actress. The enraged Voltaire wrote a poem in which he attacked this stupidity with the fiery valour of his tongue. But soon he saw himself fleeing from Paris. A mischevous printer had published without the author's permission or knowledge, Voltaire's *Letters on the English.* The bookseller was sent to the Bastille, and the book was burnt in 1734 as "being scandalous, contrary to religion, good morals, and the respect due to the authorities."

Voltaire again saw the vision of the Bastille as a possibility, and so escaped from Paris, and this time he went to live with a friend whom he had met, and with whom he had fallen in love—Madame du Chatelet—the divine Emilie. She lived in her Chateau of Cirey on the Lorraine border, and Voltaire lived with her for nearly seventeen years, when her death alone separated them. She was a remarkable woman—black hair, green eyes, large nose, with a twinkle in her eye, which signified both intelligence and sensuousness. She was not beautiful but extremely attractive, and weren't women jealous of her! Mme. de Crequi wrote, "My cousin Emilie was a colossus in all her proportions, a marvel of strength and a prodigy of clumsiness. She had a skin like a nutmeg-grater." But Mme. de Crequi was a woman, and

Voltaire, despairing of a just trial, challenged the Chevalier to a duel, and the Rohan family being frightened, induced the then Minister of Police to send Voltaire again to the Bastille. Thus came another sojourn in the Bastille, but this time, however, he was in the prison for only a few days, after which he was released on condition that he went into exile.

And so, on to England. " It is a country where men think freely and nobly, unhampered by any servile fear" (Voltaire). He was surprised at the freedom with which the English men of letters expressed what they thought. "Here was a people that had opinions of its own; a people that had remade its religion, hanged its king, imported another, and built a parliament stronger than any ruler in Europe. There was no Bastille here, and no *lettres de cachet*."[1] Voltaire found peace and religious toleration in England.

He soon learnt English, mastered English literature, and had long and cordial talks with Pope, Addison, Congreve and Swift. Voltaire also attended the funeral of Newton, and was surprised at the national honours and respect awarded to genius in that country of free men. He had nothing but praise for England:

> " Rival of Athens! London! Happy land,
> From whence was driv'n the boding, shameful band,
> of prejudice and tyrants."

In his Letters on the English or the *Lettres Philosophique*, he compared the intellectual and political liberty in England, with the tyranny current in France.

---

1. Ibid. P. 226.

Regency. "When the Regent, for economy sold half the horses that filled the royal stables, Francois remarked how much more sensible it would have been to dismiss half the asses that filled the royal court."[1] Francoise soon became famous for his witty remarks, and criticisms, not his own, were attributed to him, and as a result he found himself in the Bastille, April 16, 1717.

While in the Bastille he adopted the pen-name of Voltaire, and wrote his famous tragedy *Oedipe*, and the long epic—the *Henriade*. After eighteen months of imprisonment he was released from, what he called, the

"Palace of vengeance, dark and bodeful pile,
Where languish side by side, the pure, the vile

After his release, he once again became the favourite of the aristocracy, and among them he cultivated his polished manners, and soon developed into a brilliant conversationalist. However, once at Duc de Sully's a nasty incident took place. A certain Chevalier de Rohan, irritated at the self-confidence of Voltaire, angrily remarked, "Who talks so loud when he contradicts me?", upon which the latter replied, "Sir, he is one who does not drag a great name behind him, but wins respect for the name he has." The Chevalier left the table. A few days later, when Voltaire was at Duc de Sully's again, he got a message that somebody was waiting for him outside. He went out only to be thrashed by two hired ruffians, while the Chevalier looking on from a distance shouted. "Don't hit his head! Something good may come out of that yet."

1. Ibid. P. 223.

helping friends as in crushing enemies, able to kill with a stroke of his pen, and yet disarmed by the first advance of conciliation—so contradictory is man".[1]

His precocity was evident—already at three he knew a notoriously agnostic poem—*Mosaid* by heart. At the Jesuit school of Louis-le-Grand, while other boys were playing, Francois Arouet was discussing politics with the Jesuit Fathers. At twelve he had started to compose poems with an ease and elegance all his own, and he soon became conscious of his literary abilities; and later, on leaving college, he surprised his father by proposing to take up literature as a profession. "Literature", remarked his angry father, "is the profession of the man who wishes to be useless to society, and a burden to his relatives, and to die of hunger." But Voltaire was adamant.

He soon began to mix with the nobilty, charming the men with his sharp wit, and pleasing the ladies by correcting their verses. His father did not like the company young Francois kept, and so sent him off to Holland to stay there with the French ambassador. And there Voltaire fell in love with a young girl Olympe (whom he fondly called Pimpette). His frequent and clandestine visits to her became known, and the French ambassador, not eager to get mixed up with such 'affairs', sent Francois back to his father. His angry father once said, "My sons are a pair of madmen, one in prose and the other in verse", for Voltaire's elder brother was a fanatical Jansenist.

Francoise returned to Paris just before Louis XIV's death, and Louis XV's minority brought with it the

1. Will Durant: The Story of Philosophy P. 218.

## Voltaire — the Man.

"O, that those lips had language

FRANCOISE Marie Arouet, for that was his real name, was born in 1894. The condition of France in those days was terrible — it was a France of personal, family, and party strife. The iron hand of Louis XIV was soon removed, and the Regency during Louis XV's minority, opened the floodgates to a deluge of criticism, followed by *Ecrasez l'infame*, which was the prelude to something much more drastic, the prologue to the first act which ushered in the French Revolution three quarters of a century later.

The whole super-structure of the body politic was extremely weak, and almost tottering to its fall, nor had it anything substantial to help it raise its head again. There already existed a discontented nobility, ever at war with itself; a bourgeoisie alert and critical; and those last strongholds of the *ancien regime*—religion and orthodoxy—were dragged to the altar of reason, where they failed to stand the ordeal, and a new age dawned in France.

In the background, and mainly responsible for this failure, was one Francoise Arouet, "unprepossessing, ugly, vain, flippant, obscene, unscrupulous, even at times dishonest,"—Voltaire was a man - the faults of his time and place missing hardly one. And yet this same Voltaire turns out to have been tirelessly kind, considerate, lavish of his energy and his purse, as sedulous in

Viewing it with an open mind and putting aside all excesses, I think that the 'tradition' was a good old custom. Now that it has been stopped, I feel a little sorry. Perhaps I am wrong. Perhaps Tom Hughes was also wrong when he wrote in so spirited a manner about the custom of 'Ragging' in his "Tom Brown's school days". Reformation is good and this was just another crude and uncivilized custom abolished. Lord William Bentinck was a reformer, he abolished the 'Sutee' and hanged the thugs. The English burnt Joan of Arc at the stake because she was a witch. I wonder if this act of abolition comes under the same category. Who knows?

D. K. CHATTERJI,
M.Sc., *(Previous)*.

---

I was forced to join with the last named group for I had no safe place to retire to, and I did not relish the idea of staying in bed all day.

As evening drew to a close, excitement rose to a fever pitch. Dinner was swallowed in a hurry and good clothes were changed for old ones. The clock struck ten, and a pack of yelling, jumping seniors rushed into my room. Kicking and struggling I was lifted by a dozen hands and deposited on a chair placed upon a table. There I stood like a mascot on the top of a factory tunnel. From this exalted position I surveyed the grinning faces of my tormentors. The lights were switched off, and a bucketful of cold water (minus the bucket of course) was deposited all over me. The lights came on again and found miniature cataracts and rivers running down my body. The jeering and shouting went on. I had to introduce myself and was made to tell them all about my red coat and big China pants, as they chose to call it. They requested, or rather ordered me to sing, and when I tried to oblige them they said that stray donkeys would come running if they chanced to hear me. At this personal insult I got wild and told them that they had strayed to my room instead of the donkeys. This remark brought forth a second instalment of cold bath. I felt as if this had been going on for hours, but really it all lasted for about ten minutes. At last I signed my name on the contribution list and put down five rupees as subscription. Then they left me in peace and went to interview the next junior, all much entertained by my embarassment.

Now looking back upon that night of 'Baptism' as I like to call it, I feel that it had its good points too.

shock of earthquake. At last I fished out a nice 'sherwani' and got into it by sheer force of will and body both combined, tearing off a button in the process. Again I walked boldly along the corridor feeling very like a hero. I did not go far before, a dozen heads popped out of the windows. Soon a mob of jumping yelling boys surrounded me impeding further advance, and blocking my retreat. They were all yelling, jumping and making faces at me like a pack of devils from Dantes 'Inferno.' This time I failed to make out what they were laughing at. One of the senior students at length came to my rescue, and pushing and elbowing his way through the throng; like Achillis cutting his way through the Trojan ranks, he at last reached me. Then catching hold of my arm he pulled me out just like a cork out of a bottle. He took me to my room and told me that I had put on my sherwani all-right but had forgotton my pyjamas. I contradicted and pointed out to him that I had my shorts on. Laughingly he pointed out my mistake and went away. So for the third time I had to change my attire. This time I walked to the dining hall in a tolerable pyjama and a 'sherwani' minus one button. There was no more mistake, and I had my belated dinner in much the same frame of mind as the Duke of Wellington after the Battle of Waterloo.

## The 'Tradition'.

The juniors were in a state of suppressed excitement that day. News had leaked out from reliable sources that the 'Tradition committee' had been formed. Some of us fled to the city as if for our very lives, some pretended to be ill and stayed in bed. But some there were who put on a bold and defiant look and awaited developments.

## *Those Undergraduate Days*

### MY FIRST DAY'S EXPERIENCE OF HOSTEL LIFE.

DRESSED in a pair of trousers, too large even for two people like me put together, and a coat of bright red colour, I marched along behind my father trying to look as brave as Napoleon, but really looking like a mutineer who was about to walk the plank. He took me to a hostel where I was told to deposit myself and my camp baggage in a room, and there papa left me. I felt much like a fish out of water but there was no help for it. After much calculation and deliberation I ventured to ask my ward-boy about my rations. That fellow pointed out the dining hall to me and said that if I meant to have something, I had better go there. Napoleon once remarked, it seems, that an army marches on its stomach. Then I felt as starved as a soldier. Out I sallied in my big trousers and red coat. I was much astonished when a group of boys began to laugh as I passed them. One cried out "Look at the Chinaman." Another shouted at the top of his voice "He is a walking red cross sign-post." I understood that my dress had excited their attention, and very prudently I beat a hasty retreat. I felt much relieved when the door of my room closed behind me. Now for the first time in my life I began to think seriously about my dress and personal appearance. I pulled out my whole wardrobe out of my suit case. Out came red coats and green pants, yellow shirts and blue knickers, sherwanis, pyjamas and what not. Soon the room looked like a tailor's shop after a mild

democracy as was done in the British Provinces and themselves occupy the royal and exalted position that Governors enjoy in those places, with the great and significant addition of a personal affection that they will always command in the hearts of the people. If the princes trusted the capacity of their subjects for democracy, it would be the greatest moral contribution for the attainment of freedom for the motherland as a whole. I shall not detain you any further.

I thank you for having listened to me so patiently.

DR. C. RAJAGOPALACHARI.

---

University and from the chances in life open to the Osmania graduates. The problem is complicated everywhere, and more so in Hyderabad. We may not get ideal solutions but must be content at present with compromises and experiments. One compromise regarding Secondary education would be that of enforcing Urdu as a language subject while imparting instruction in all subjects through the medium of the regional language but accompanied by a liberal use of the terms of science and art used in the Osmania University for higher courses in the same subject. But I should not trespass into this problem any further. I hope that the passage from English to Indian languages may not be rendered needlessly difficult by the development of passion and prejudice, and by stressing the theoretical advantages of administratively impracticable alternatives.

I have not touched politics so far. I do not propose to do so here because I have very recently put down my views on the present situation in very clear terms in a booklet written for that purpose and I have nothing to add to it. I would like however to say one thing from this platform to this gathering of the most enlightened section of Hyderabad people. I hold the view that it is an erroneous belief that is carelessly spread that the citizens of Indian States are politically inferior or backward compared to the citizens of British Indian Provinces. National consciousness has spread all over India at one and the same pace everywhere. The citizens of Indian States are as fit and as ready, or as unfit and as unready, for democracy as citizens of the British Provinces are. Our princes can today without disturbing the efficiency of administration grant representative institutions and constitutional governments on a basis of parliamentary

and ought to go up to the next stage from those who cannot do so is not practicable. As a result of all these causes, the perfect organisational conditions required for one stage are complicated by the requirements of the next stage. This affects not only the subject-matter of the instruction given but also the question of medium of instruction. Those who are responsible for the organisation of Secondary education cannot shut their eyes to the fact that the best and a large number of others among the students in High schools legitimately look forward to go to the University courses, and that it cannot be decided beforehand who may be permitted to aspire to it and who may not be. We should not forget that University education has not been undertaken through the medium of Kannada, Telugu or Marathi in Hyderabad or anywhere in India for that matter. The English medium prevails everywhere in Universities and this queers the pitch for any reform in Secondary education.

The fact that the Osmania University imparts instruction in the highest courses through Hindustani directly affects the medium to be adopted for Secondary education. If up to the last point in Secondary schools, the instruction should be given through the medium of the mother-tongue other than Urdu, it may be feared that a large body of the students would be ill-equipped for the University course to which they may legitimately aspire. If the Government of Hyderabad made the apparently good rule that in the Kannada, Telugu and Marathi areas Secondary education shall be imparted through these languages respectively, what would the parents of the best boys and girls say as to the necessary consequence of this, *viz.*, that they would be practically excluded from higher courses available in the Osmania

University and from the chances in life open to the Osmania graduates. The problem is complicated everywhere, and more so in Hyderabad. We may not get ideal solutions but must be content at present with compromises and experiments. One compromise regarding Secondary education would be that of enforcing Urdu as a language subject while imparting instruction in all subjects through the medium of the regional language but accompanied by a liberal use of the terms of science and art used in the Osmania University for higher courses in the same subject. But I should not trespass into this problem any further. I hope that the passage from English to Indian languages may not be rendered needlessly difficult by the development of passion and prejudice, and by stressing the theoretical advantages of administratively impracticable alternatives.

I have not touched politics so far. I do not propose to do so here because I have very recently put down my views on the present situation in very clear terms in a booklet written for that purpose and I have nothing to add to it. I would like however to say one thing from this platform to this gathering of the most enlightened section of Hyderabad people. I hold the view that it is an erroncons belief that is carelessly spread that the citizens of Indian States are politically inferior or backward compared to the citizens of British Indian Provinces. National consciousness has spread all over India at one and the same pace everywhere. The citizens of Indian States are as fit and as ready, or as unfit and as unready, for democracy as citizens of the British Provinces are. Our princes can today without disturbing the efficiency of administration grant representative institutious and constitutional governments on a basis of parliamentary

and ought to go up to the next stage from those who cannot do so is not practicable. As a result of all these causes, the perfect organisational conditions required for one stage are complicated by the requirements of the next stage. This affects not only the subject-matter of the instruction given but also the question of medium of instruction. Those who are responsible for the organisation of Secondary education cannot shut their eyes to the fact that the best and a large number of others among the students in High schools legitimately look forward to go to the University courses, and that it cannot be decided beforehand who may be permitted to aspire to it and who may not be. We should not forget that University education has not been undertaken through the medium of Kannada, Telugu or Marathi in Hyderabad or anywhere in India for that matter. The English medium prevails everywhere in Universities and this queers the pitch for any reform in Secondary education.

The fact that the Osmania University imparts instruction in the highest courses through Hindustani directly affects the medium to be adopted for Secondary education. If up to the last point in Secondary schools, the instruction should be given through the medium of the mother-tongue other than Urdu, it may be feared that a large body of the students would be ill-equipped for the University course to which they may legitimately aspire. If the Government of Hyderabad made the apparently good rule that in the Kannada, Telugu and Marathi areas Secondary education shall be imparted through these languages respectively, what would the parents of the best boys and girls say as to the necessary consequence of this, *viz.*, that they would be practically excluded from higher courses available in the Osmania

this natural and indefeasible right of the mother-tongue, the problem becomes complicate and calls for the exercise of patience and compromise all round. I have no doubt the question is receiving the continued and open-minded consideration of His Exalted Highness' Government. The happiness of the Sovereign is bound up with the contentmont and progress of his peoplé and there is no short-cut for progress eschewing the path of true and effective education. The conditions of modern education are, however, complex, and State policy has to cover a wide ground. Peace and toleration create as great difficulties as their opposites. Several peoples have come together, several faiths live together, several languages flourish side by side in the same State as a result of peace and toleration. The problem of positive service on the part of the State to the composite population thus placed together under its care becomes very complex and difficult.

Not only this, but there are other difficulties arising out of the complexity of modern developments in education. Almost the whole burden is thrown on the schools run by the State, the family contributing but little towards the preliminary education of the child. The divisions of education into Primary, Lower Secondary, Higher Secondary and University courses are not water-tight. They are not isolated courses. In no one stage is the training quite so independent of the requirements of the next stage as the authorities dealing with the matter would wish it were. Each stage is for the most deserving and for a large number of hopefuls, a preparation for the next stage as much as it is an independent course by itself for the others. Differentiation of those who can

skeleton at the feast, the medium of instruction in Secondary education. The announcement of the invitation extended to me to deliver this Convocation Address was a signal for several public workers to open correspondence with me on the State policy in respect of the medium of instruction for Secondary education. I made it clear to my correspondents that it was not my intention for entering into any discussion of Hyderabad policy. I am too keenly alive to the difficulties of administration specially in the formulation and working of educational policy in an area composed as Hyderabad is, of people speaking four different great languages each with affiliations abroad and literatures of which they are justly proud. Any light-hearted and hasty criticism or advice can be exploited to increase existing difficulties. But I do not wish to minimise the importance of the issue involved. I have already stated in explicit terms the fundamental creed of education through the mother-tongue to which I adhere. Sir Akbar Hydari and His Exalted Highness have both clearly laid down in unambiguous terms that the student's mother-tongue is the only effective medium for the acquisition of knowledge and for the complete conversion of what is acquired into a part of one'e own being. But our loyalty to a creed should not result in blind passion or a refusal to see facts. On the one hand, uniformity of rule and procedure is the normal aspiration and consequence of every modern unified administration. This cannot be ignored or belittled. It is absolutely true that the claim of the mother-tongue is one that cannot be neglected without serious injury to the cause of education, which means injury to the State itself in the long run. But it is equally true that when more than one language claims

Sciences and Humanities. Hyderabad has rendered signal service to the lingua franca of India by its bold and successful experiment in Urdu. The name Urdu should not be a cause for underrating this achievement.

I am one of those whose confirmed opinion is that the students' mother-tongue is the best and most fruit-bearing medium of instruction. As I said already we ought to have at least one efficient University in India for every one of the great languages spoken by the people of India, so that students from all parts of India may choose where to go according to what their mother-tongue is and get instruction in the highest branches of arts and sciences. The question of what is the most effective medium is placed beyond controversy by the recorded opinion of the All-India Universities Conference that held its deliberations in Bombay in March 1939. They passed a resolution that in their considered opinion the medium of instruction at different stages of education up to and including the Degree course should be the mother-tongue of the students and that with a view to attaining this end, the Universities of India should take steps to enrich the literature of the respective Indian languages. No University has made an adequate or perhaps even an honest endeavour in the fulfilment of this urgent educational object. The Osmania University took up the task 25 years ago and its achievement is such that it should serve as a beacon-light to others whose duties in this direction centre round the other great Indian languages.

I have said so much about the achievement of the Osmania University in respect of the lingua franca of India. But I am not unaware of what may be called the

other name. While we are quite able to swallow the English camel—language, script, idiom, phrases and all—we strain at the gnat of Hindi or Urdu because of the difference in a certain measure of vocabulary. It has been conceded that it is possible even to adopt a third script, Roman, without damage to the identity of the language. Indeed large numbers in the Civil and Military services are today learning through the medium of Roman script what we all recognize as the lingua franca of India. As regards the proportion of Sanskrit borrowings as against words taken from Arabic and Persian, is it really a great point when there is no difference in structure, idiom or grammar or in the main bulk of the vocabulary of the language? If our ultimate goal is the enrichment of the vocabulary of Hindustani and the use of it as a medium for every variety of higher knowledge, the difference between Hindi and Urdu based on present vocabulary is bound rapidly to vanish. The enrichment of the language that is yet to be achieved by use in the teaching of modern knowledge will leave present differences in vocabulary far behind. Wealth and variety are advantages and not a cause for quarrel. The suitability of Hindustani as a lingua franca consists in the very fact that it has been handled by and modified to suit the requirements of the elite both among Hindus and Mussalmans, and has been for long written in both Urdu and Nagari scripts. The enrichment of vocabulary from Hindu as well as Islamic sources, far from being a difficulty or cause for quarrel is the very proof of its competence for common service. There is and can be no compulsion in choice of words.

There is no University that has made Hindi as such the medium of instruction qualifying for degrees in

Osmania University laid all India and all Indian languages under debt by the bold recommendation he made and the courageous execution of the plan laid down. The Bureau of Translation which was founded along with the University became naturally the chief feature of the work that was inaugurated twenty-five years ago. All instruction in the University was to be through Hindustani, English being given its proper place as a compulsory language subject. Quoting Mr. Vincent Smith, the historian, Sir Akbar Hydari pointed out in his memorandum about Hindustani that its syntax was simple and flexible as was claimed for English, its vocabulary was rich with an abundance of words drawn from Western Hindi, Sanskrit, Persian, Arabic, English and other sources, and it was capable of expressing ideas on any subject, literary, philosophical and scientific.

I have referred to the medium of instruction in this University as Hindustani though the official name adopted is Urdu. It is a paradox, but none the less true that in a world dominated by prejudices, small differences cause wider gulfs than very big differences. The difference between Urdu and Hindi is insignificant, almost microscopic, compared with the yawning gulf between any Indian language and English. But we are able more easily to reconcile ourselves to getting all our schooling, not to speak of higher instruction, done through English than to overcome the prejudice against Hindi or Urdu. Yet if what is spoken and understood under these two names be written in one script, the difference will not be greater than that which marks the language of Johnson's *Rasselas* as compared with that in which Goldsmith wrote the *Vicar of Wakefield* or Charles Lamb his essays. We do not call the one English and the other by some

various Universities scattered over India where the highest branches of knowledge are dealt with in one or other of our ten great languages. The smallest of these languages is spoken by populations larger than that of Portugal or of Scotland and Ireland combined, and many of them are spoken by larger numbers than the population of Spain. Each one of them possesses an abundant literature of its own, prose, poetry, song, drama and fiction. Unfortunately as yet even the Universities born in the new-found consciousness and renaissance of India, the Andhra University, the Mysore University, and the Annamalai University have not taken steps to impart University education of the highest type in Telugu, Kannada or Tamil nor is there any chartered University that has adopted or is preparing to adopt Marathi or Bengali as its medium. The great University of Benares has not yet resolved on any adventure in the direction of adopting the lingua franca of India as the medium of instruction for the higher University courses. I am not indulging in cheap criticism without realising difficulties. It is because I know the difficulties, that I admire the courage, the patient industry, and the achievement that the Osmania University has shown to its credit as a shining example for all India. Let us hope that the Osmania experiment will enable all of us throughout India to overcome the difficulties and set aside the illusion, which is the greatest of the difficulties, that there is anything insuperable in giving the highest instruction through any one of the great languages of India, be it Hindustani or be it Telugu or Tamil or Kannada or Marathi or Bengali or Gujarati.

Sir Akbar Hydari on whose advice His Exalted hness issued his *firman* in 1918 and founded the

gorgeous coat but apprehend it as one whole. You do not understand it as a conglomeration of several separate colours. So it is with what I call the culture of India, and it is of that you are trustees.

On behalf of the assembled gathering here, I congratulate you and give you our best wishes. I hope that you will fulfil with honour and efficiency the duties cast on you in return for the special concern which the State and learned men engaged for the purpose have spent on you through the period of fifteen years of BRAHMACHARYA which you have finished today.

The Osmania University is unique in all India in that the highest scientific education as well as the teaching of the Humanities are done through an Indian language, the rich joint product of Muslim and Hindu contact. It is unique because every other University throughout India uses the English language and from what one can see has no intention of using any other medium within a measurable distance of time. The teachers established in the Universities and the books in vogue form a conservative fortress of exceeding strength. The place of English in the administrative machinery of India and of almost every state and province in India completes the apparent impregnability of the fortification. Yours is an achievement of which not only you but all India should be proud. The only language that can claim to be an all-India language is Hindustani and that is the medium of instruction in this University. Yours, then, is the true Vidyapith, the Swadeshi University of all India.

Let us hope that all difficulties will be overcom
are being overcome here, and that there will

duty than those who are sent out by the older Universities. By your love of learning and continued application and more than that, by your enlightened conduct, you should bring credit, distinctive credit to your University. Remember that you are the products of an important experiment, *viz.*, the imparting of the highest modern learning through an Indian language. You will be rigorously judged by critics who have received their own training through the unnatural, though may-be-at-present richer medium of a foreign language. Not only is there no reason for you to feel inferior, but you have every cause for just pride and confidence. If you maintain your habits of study and regard for truth, and keep your faculty for right judgment whetted with daily practice and verification, if you are wary and keep your sense of values unspoiled, you will not find it difficult to do your battle of friendly rivalry with others however industriously trained through a foreign language. You can go about it with complete confidence.

I referred to culture and indicated that you formed part of the body of trustees for India's culture. What I call Indian culture is one and indivisible. I take it that this is the creed of this University. Separate cultures referred to in controversy are hypothetical ideas framed *ad hoc* for the purpose of a stage in investigation and reasoning. We should not confound religion or religious practices with culture. The culture of India with all its varieties is in fact one. It is single and indivisible, even as the climate of India is one, with all its varieties. The composition is itself a distinctive unit, as old as English culture. You do not analyse the of a peacock or of a spotted deer or the tiger's

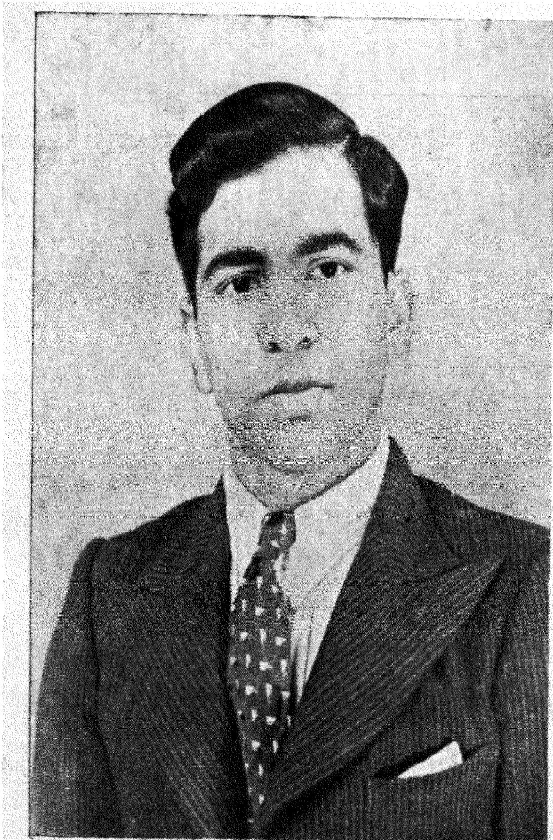
# Convocation Address, 1944.

**Mr. Chancellor, Mr. Vice-Chancellor, Mr. Pro-Vice-Chancellor, Fellows and Graduates of the University.**

*Ladies and Gentlemen,*

IT is a great honour done to me by the authorities of the University that I have been invited to speak at this Convocation. I tender my grateful thanks to His Exalted Highness and to the University for conferring on me this privilege. The University has worked for 25 years and qualified for its Silver Jubilee this year and I am happy to tender my congratulation to the Chancellor and the Government on their achievements. The last time I was on these grounds your late chancellor was alive. It is too sad for words that I come here to fill a place in this function after he is gone for ever. I am proud of the love and regard which he chose to bestow on me. This is no occasion for referring to private friendship however insistent be the memory. Sir Akbar Hydari gave of his best to Hyderabad. May his soul rest in peace, and that of his dear wife who lies interred here as a sacred relic of Sir Akbar's connection with Hyderabad.

I congratulate you graduates who have just received your degrees, especially those who have received them with distinction. You are part now of the precious stream which must water, nourish and maintain the living culture of our people. As graduates of a relatively young University you have a more par



G. HANUMANT REDDY, LL. B. ( Final ).
( Asst. Editor, English Section ).



RAHIMUDDIN KAMAL ZAHEERABADI, B.
( Asst. Editor, Urdu Section ).



SAEED AHMED MEENAI, M. A. ( Final ).
( Editor, English Section ).

institution which bears the name of our August Sovereign to whom the whole of of India is so deeply indebted, and the University which was 'the golden vision of Sir Akbar' will then prove to 'be the greatest movement in Indian Education in modern times'.

* * * * *

We offer our hearty congratulations to the Economics Association which made a unique beginning last year by publishing a dozen useful pamphlets on current economic problems. It is scarcely possible to express adequately the debt of gratitude this association owes to Dr. Anwar Iqbal Qureshi and it is very largely if not entirely due to his enthusiastic endeavours that the Economics Association is able to steal a march over rival societies in each and every sphere of activity.

* * * * *

I would be failing in my duty if I did not extend my hearty thanks to our Adviser Prof. M. S. Doraiswami who was ever willing to attend to the affairs of the Magazine with unabated interest.

SAEED AHMED MEENAI,
M.A., (Previous),
*Editor, English Section.*

other fees charged by the University, which are moderate enough, but to the fact that a certain number of students, who can afford to do so, set the pace and most of the rest try to keep up with them and thus live beyond their means, while those few who are too wise or too timid to do so, feel small and remain out of the swim. This applies more to students in the Intermediate and under-graduate classes than to students in the post-graduate classes,

The above mentioned short comings should under no circumstances be considered as peculiar to our own Alma Mater; on the contrary they are perhaps eating into the vitals of University life throughout the country, if not all over the world.

It seems desirable that leadership of the community of students should remain with those who fully realise the high ideal of education, namely of plain living and high thinking. These notes have not been thrown away in any spirit of destructive criticism, but are an honest attempt to face unpalatable realities with a view to remedying them.

* * * * *

No doubt, it is the sacred duty of every one of us to see that the honour and the fair fame of Osmania University which lies in our keeping is not stained or tarnished. This can be achieved by talking less and thinking more. We must bend all our energies to the task and devote every fibre of our being towards achieving it. And then rest assured that all criticism and opposition that this unique educational experiment has to encounter today will soon dissolve in thin air.

inception of the Osmania University was said to be 'the inauguration of a University in which the knowledge and culture of ancient and modern times may be blended so harmoniously as to remove the defects created by the present system of education and full advantage may be taken of all that is best in the ancient and modern systems of physical, intellectual and spiritual culture." Instead of having our eyes glued solely on the word 'modern,' we must fully realise that the primary object of this great University is the achievement of a harmonious blend of ancient and modern culture.

We must pay due attention to the spiritual and cultural aspect of our training and thus endeavour to possess a real sense of higher values. It is true that religion is essentiaily a matter of spirit rather than of outward forms, but it is equally true that unbroken conformity with certain forms for a considerable period in most cases gives birth to the spirit of which the said forms are but the outward expression and symbol. How wisely said Tennyson in his "In Memoriam"

'Let knowledge grow from more to more
But more of reverence in us dwell,
That mind and soul according well,
May make one music as before,
But vaster.................................

* * * * *

The standard of living at the University has risen considerably during the last five years or so. Reference is not made either to the rise in the cost of living conse-...nt on the rise in the general rise of prices throughout ...try, which is inevitable, or to the tuition and

# Editorial

---

WITH this issue, our Magazine reaches the sixteenth milestone of its career. "Our life is gorgeous with tomorrows," it is so frequently asserted, and this, we expect, will particularly be true of our Magazine which can justly look forward to a roseate future far more illustrious than its past.

* * * * *

By the time that this issue sees the light of day, a huge batch of freshers will have entered the portals of our University and it is indeed to them that the following comments of friendly advice are more particularly addressed.

Union is strength. The truth of this proposition has now come home even to labourers, to say nothing of students. But we have yet to realise that the strength which union confers is a blessing only if it is used with a full sense of responsibility and in the service of causes really noble and worthy.

The root cause of many evils is, in our opinion, the growing lack of reverence among students. In impatiently pretending to be 'enlightened' and 'modern,' many a present day collegian profoundly lacks reverence for his seniors, his teachers, his leaders and apparently for the tenets of his faith. The purpose